احمد جاوید

O

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عسکری صاحب پر ہماری یعنی قیصر عالم، میری اور آپ کی جو گفتگو 'شب خون' میں چھپی تھی، صابر وسیم صاحب نے ''ارتکاز'' میں اور محترم مُبین مرزا نے ''مکالمہ ۸'' میں اُس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اُمید ہے آپ کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ زیادہ شامت اس مسکین کی آئی ہے، کیوں کہ نزلہ عضوضعیف ہی پر گرتا ہے۔

میں دونوں اصحاب سے خوب واقف ہوں۔ ان کی استعداد کا حال مجھ ایسے اندھے پر بھی روشن ہے۔ اسی لیے یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان بھلے مانسوں کو ایک ایسے مبحث میں کود پڑنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ جس کی الف بے کا بھی انہیں پتا نہیں ہے۔ چلیں مبین مرزا صاحب کا مسئلہ تو سمجھ میں آتا ہے۔ مدیر آدمی ہیں اور ان میں اس چیز کا پایا جانا چنداں تعجب خیز نہیں جسے حدیث شریف میں مفلس کا تکبر فرمایا گیا ہے۔ وہ تو افلاطون سے بھی بھڑ سکتے ہیں۔ لیکن بھائی صابر وسیم کو کیا ہوگیا! انہیں تو اپنی قلیل البضاعتی کی پوری خبر ہے۔ وہ کس جھونک میں ادھر نکل آئے!

ان کی تحریریں دیکھ کر پہلے تو یہی خیال آیا کہ گونگوں کی للکار اور لنگڑوں کی یلغار کا نوٹس نہیں لینا چاہیے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں نظیری والا رویہ ہی مناسب ہے: ''......من مرد میداں نیستم۔'' مگر دو چار روز بعد اچانک احساس ہوا کہ نہیں، یہ تو اللہ معاف کرکے، صریحاً تکبّر ہے۔ اس احساس نے ایسا زور پکڑا کہ جوابی مضمون لکھنے کا ارادہ باندھ لیا، لیکن اس پر بھی قائم نہ رہ سکا۔ سوچا کہ چڑی ماری ہی تو کرنی ہے۔ اس کے لیے اتنی سردردی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو ہنستے کھیلتے بھی ہوسکتا ہے۔ اس کی یہی ترکیب مناسب معلوم ہوئی کہ ایک خط لکھا جائے جس میں مخاطب تو کسی بے تکلّف دوست کو بنایا جائے مگر روئے سخن مبارزہ طلبوں کی اس جوڑی کی طرف رکھا جائے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ظاہر ہے یہ غرض آپ سے بڑھ کر کون پوری کر سکتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اُس مغضوب و مبغوض گفتگو کے محرک و مہتمم جناب ہی تھے، اور شریک غالب بھی۔ لہٰذا آپ کو مکتوب الیہ بنانا کچھ ایسا ناروا بھی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک مجبوری بھی ہے۔ قول کا ایک خالق سامع بھی ہوتا ہے۔ مخاطب باشعور، ذی علم اور نکتہ رس نہ ہو تو بہت سی باتیں ان کہی بلکہ ان سوجھی رہ جاتی ہیں۔ اب اگر مخاطب ہوں جناب صابر وسیم اور محترم مبین مرزا...... تو آپ خود سمجھ لیں کہ متکلم بچارا تو گنگ اور بانجھ ہو کر رہ جائے گا۔

خیر، آمدم برسر مطلب۔ دونوں مضامین میں اعتراضات اور ان کے مواد کم و بیش مشترک ہیں۔ البتہ صابر وسیم صاحب ہمارے خیالات کے ساتھ ساتھ نیتوں کا بھی تجزیہ اور محاکمہ کرنے بیٹھ گئے۔ کم از کم اس معاملے میں مبین مرزا صاحب ڈھنگ کے آدمی نکلے۔ انہوں نے ناسمجھی کا تو پیٹ بھر کے مظاہرہ کیا مگر الزام تراشی اور بہتان طرازی سے مجتنب رہے۔ ذہین یا غبی ہونا ایک تقدیری امر ہے۔ اس سے آدمیت کا جوہر متعیّن نہیں ہوتا۔ لیکن دیانت اور خدا خوفی سے دست بردار ہو جانا افسوس ناک ہے۔

صابر وسیم صاحب نے ہم تینوں کو 'علمیت کا سکّہ جمانے اور اہل ادب کو چونکانے کی طفلانہ کوشش کرنے والے بزدل سازشی' وغیرہ قرار دینے کے بعد اِس ناچیز کو خاص طور پر ہدف بنایا ہے...... خودنمائی، حماقت، موقع پرستی، غداری، نفاق، جبن، فریب کاری...... غرض ایسے کتنے ہی اوصاف اس ننگِ آدمیت سے برآمد کیے ہیں۔ میرے یہ دیرینہ دوست اگر عیب نمائی اور خبث شناسی کا یہ مظاہرہ کسی اور موقعے پر، اور ذرا خیر خواہی کے ساتھ کرتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ میرا فوری ردعمل احسان مندی اور شکر گزاری کا نہ ہوتا۔ مجھ میں کوئی چیز یقینی ہے تو وہ نقائص و مصائب ہی ہیں۔ غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے۔ لیکن مشکل یہ پیدا ہوگئی ہے کہ صابر وسیم صاحب نے میرے بارے میں اپنے انکشافات کو جس بنیاد پر استوار کیا ہے۔ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، یعنی عسکری دُشمنی۔ نیز بُرے سے بُرا آدمی بھی تمام برائیوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اسے حسن اتفاق ہی سمجھنا چاہیے کہ میرے موجودہ عیوب کی طویل فہرست میں مذکورہ بالا خرابیاں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم۔ اب میں ڈٹ کر کہہ سکتا ہوں کہ بھائی! کچھ تو خدا کا خوف کیا ہوتا۔ آخر اسے بھی منہ دکھانا ہے۔

صابر صاحب نے عسکری صاحب پر ہماری گفتگو کا ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ ہم لوگ یعنی

آپ، میں اور قیصر عالم، اپنی علمیت کا سکّہ جمانا چاہتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اُس مکالمے میں دو ایک جگہ پر بالکل واضح ہے کہ شرکائے گفتگو اظہارِ علمیت سے بچنے کی سعی کر رہے ہیں۔ خود مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ مثلاً روایت کے موضوع پر بہت سی باتیں محض اس لیے ناگفتہ چھوڑ دی تھیں کہ خربوزہ کاٹنے کے لیے تلوار نکالنے کا تاثر نہ پیدا ہو جائے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ بعض مسائل پر بات کرتے ہوئے اندازِ علمی رکھا ہے۔ اور یہ ناگزیر تھا۔ اب صابر وسیم صاحب اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اسے علمیت کا سکّہ جمانے سے تعبیر کریں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

علمیت والا فقرہ ابھی ڈھنگ سے مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ موصوف نے یہ فتوا بھی جڑ دیا کہ یہ گفتگو اہلِ ادب کو چونکانے کی ایک طفلانہ کوشش ہے اور بس۔ لگتا ہے ان بزرگوں کو خبر ہی نہیں کہ مُردوں کو چونکانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اپنے قارئین کو اس طرف سے خبردار کرنے کے بعد صابر وسیم صاحب نے انہیں یقین دلایا ہے کہ:

> ''اس گفتگو پر تجزیاتی تبصرہ کرتے ہوئے میرا رویہ بالکل سنجیدہ ہے، اور میں نے پوری کوشش کی ہے کہ اسی سطح پر اُتر کر بات کی جائے جس سطح پر رہ کر یہ گفتگو کی گئی ہے......''

مضمون کی تمہید میں جب یہ جملہ سامنے آیا تو ہنسنے کی بجائے میں ڈر گیا کہ خدا خیر کرے، انہوں نے ایسی کون سی حبِ فلک سیر کھالی ہے کہ اُس گفتگو کی سطح پر اُترنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ لیکن اگلے پیرے تک پہنچتے پہنچتے وہ ڈر غائب ہو گیا اور اصل بات کا سُراغ مل گیا۔ صابر وسیم صاحب اُس گفتگو کی سطح کا دور بینی مشاہدہ کرتے وقت پیروں کے بل نہیں کھڑے تھے۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت کو کس سطح تک اُترنا بلکہ گرنا پڑا ہے:

> ''اب تک تو ترقی پسند اور عسکری کے دیگر مخالفین اپنی واضح صف بندی رکھتے تھے جن کی شناخت بہت آسانی سے ہو جاتی تھی۔ مگر مخالفین کا یہ نیا گروہ تو خود عسکری کے کیمپ میں چھپا بیٹھا تھا۔ ''چھپا بیٹھا'' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان حضرات کے بارے میں، خصوصیت سے احمد جاوید صاحب کے متعلق اہلِ ادب یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ عسکری کی فکر کے جید پیروکاروں سلیم احمد اور سراج منیر سے شدید قربت رکھتے تھے اور اسی حوالے سے انہیں عسکری کے ادبی نظریات سے وابستہ سمجھا جاتا تھا...... مگر زیرِ تبصرہ گفتگو تو بتاتی ہے کہ انہوں نے کبھی عسکری کی فکر

کو قبول ہی نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے نجانے کسی مصلحت کے تحت اتنے طویل عرصے تک خاموشی اختیار کیے رکھی۔ لیکن اب جو وہ اپنے زرّیں خیالات طشت ازبام کرتے ہیں تو اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ عسکری کے جنرلز سلیم احمد اور سراج منیر اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں اور ان کے دیگر کمانڈرز جن میں جمال پانی پتی اور سجّاد میر وغیرہ شامل ہیں، ہتھیار پھینک کر گھروں میں بیٹھ گئے ہیں......"

خدا شاہد ہے کہ یہ عبارت نقل کرتے ہوئے میں گویا پل صراط پر چل رہا تھا۔ ایک لفظ نقل کر کے دوسرے کے لیے پھر اصل کی طرف مڑنا پڑتا تھا کہ مبادا کوئی جملہ زبان و بیان کے لحاظ سے بے عیب بن جائے۔ اس عمل پیہم سے گردن دکھنے کو آ گئی۔ چلو یہ بھی جھیل لیا۔ لیکن اصل مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ ان باتوں کا جواب دینے کے لیے ایک ایسا کام کرنا پڑے گا جس سے مجھے واقعتاً گھن آتی ہے اور وہ ہے اپنے بارے میں گفتگو کرنا۔

یہ بات سو فی صد درست ہے کہ میری ذہنی اور ادبی تربیت سلیم احمد کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ یہ نصیب اللہ اکبر! سخت فرومایگی کے باوجود میرے پاس جو کچھ ہے وہ انہی کی کفش برداری سے میسّر آیا ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو بلاشبہ میں اُن کے مرشد پر زبانِ جرح دراز کرنے کی ہمّت نہ کر پاتا۔ صابر وسیم صاحب اسے بزدلی کہہ لیں، نفاق کا نام دے دیں، مگر بات یہی ہے کہ میں انہیں ناخوش نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس کا کیا کیا جائے کہ آدمی سدا بچہ نہیں رہتا۔ اسے بڑا بھی ہونا پڑتا ہے۔ آج میرے اکثر خیالات و تصورات وہ نہیں رہے جو سلیم احمد کی زندگی میں تھے۔ ان بدلے ہوئے خیالات اور نظریات پر مجھے سر دست اتنا اعتماد ضرور ہے کہ میں کسی گھمنڈ یا جھجک کے بغیر خود کو کسی بھی شخص کا سامنا کرنے پر تیار پاتا ہوں۔ چاہے وہ محمد حسن عسکری ہی کیوں نہ ہوں۔ سلیم بھائی کے اثر سے اُن کی جو ہیبت دل و دماغ پر مسلط ہو گئی تھی، وہ اب خاصی کم بلکہ یوں کہہ لیں کہ ختم ہو چکی ہے۔ گو کہ یہ خیال آج بھی برقرار ہے کہ عسکری صاحب اُردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں، لیکن اُردو تنقید کا مجموعی معیار دیکھ لینے کے بعد یہ افضلیت کوئی بہت بامعنی اور لائقِ رشک چیز نہیں لگتی۔ پہلے اُن کی ندرتِ فکر پر ایمان تھا، مگر جب یہ پتا چل گیا کہ فکری امور میں اُن کی حیثیت ایک ناقل سے زیادہ کچھ نہیں، وہ بھی کوچ کر گیا۔ اب میرے لیے اُن کے اعترافِ عظمت کی دو ہی بنیادیں بچی ہیں: اسلوب اور نکتہ آفرینی۔ بقولِ جوش "یہ ایک تبسّم بھی کسے ملتا ہے۔" مختصر یہ کہ سلیم احمد کی حد تک تو صابر وسیم صاحب کی قیاس آرائی صحیح ہو سکتی ہے، لیکن برادر

بجاں برابر سراج منیر کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت وہ نہیں تھی جو صابر صاحب نے فرض کر رکھی ہے۔ وہ جو تاثر دینا چاہ رہے ہیں، صورتِ واقعہ اس کے برعکس تھی، بالکل برعکس۔ وہ اُس گفتگو میں شریک ہوتے تو اُن کی رائے بھی وہی ہو جاتی جو یاروں کی ہے۔

اور یہ جو جمال پانی پتی صاحب اور سجاد میر صاحب کی عزت افزائی ہوئی ہے، اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ ان دونوں کو تو مزا ہی آ گیا ہوگا...... ویسے یہ اطلاع میرے لیے بھی نئی ہے کہ میر صاحب بھی خانِ اعظم محمد حسن عسکری کی افواجِ قاہرہ میں بھرتی ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔

صابر وسیم صاحب برا نہ مانیں تو ایک مشورہ دوں۔ اب سجاد میر کے آگے نہ پڑیے گا۔ خطرناک آدمی ہیں، ہتھیار پھینک دینے کے باوجود بہت کچھ کر سکتے ہیں اور پھر میری سرکوبی کے لیے تو اُن سے کمک مانگنے کی غلطی بھی نہ کیجیے گا۔ آپ مشکل میں پڑ جائیں گے۔

اب ذرا ایک اور اقتباس برداشت کر لیجیے:

> ''آصف فرخی کے ابتدائی کلمات کے بعد قیصر عالم صاحب نے آغاز میں ہی عسکری صاحب کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی 'ادبی عسکری' اور 'روایتی عسکری' اور اسی مقام پر آصف فرخی صاحب نے عجب متضاد جملوں پر مشتمل پہلا سوال احمد جاوید کی طرف اچھالا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہم گفتگو کے آغاز میں ہی عسکری صاحب کو تقسیم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میرے ذہن میں آپ سے (احمد جاوید سے) جو سوال آتا ہے کہ مجھے مجموعی طور پر، یعنی بحیثیت ایک کل، ان کا اُردو ادب یا جدید اُردو فکر میں کیا مقام بنتا ہے؟ کیا وہ ایک مقام ہے یا وہ تقسیم شدہ شخصیت تھے؟''...... اس سوال سے ہی ان حضرات کے عزائم کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں اُردو ادب میں عسکری صاحب کا مقام ہی مشکوک نظر آتا ہے اور ان کی شخصیت بھی تقسیم شدہ نظر آتی ہے......''

اللہ اللہ! اس سخن فہمی پر عسکری صاحب کا دفاع کیا جا رہا ہے جس پر بھروسا کر کے اخبار بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔

آدمی کو دل آزاری سے بچنا چاہیے تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ پستی کی پیائش کرنے والا ایسا کوئی پیمانہ تا حال ایجاد نہیں ہوا جس سے وہ گراوٹ ناپی جا سکے جو اس مضمون میں جابجا نظر آتی ہے۔ تعجب ہے ایک مدت سے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے باوجود صابر وسیم صاحب اتنا بھی نہیں جانتے کہ

قیصر عالم نے محمد حسن عسکری کو ایک بین الاقوامی حیثیت کے نقاد کے طور پر متعارف کروانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔ اُن کے مضامین کو انگریزی میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور انہیں عالمی سطح پر لانے کے لیے ایک معیاری اور مقبول پرچا نکالا: Studies in Tradition ...... نئے ذہن اور طرزِ احساس میں عسکری کے لیے ایک قدرتی مغائرت پائی جاتی ہے۔ آصف نے اس مغائرت کو مٹانے یا سمیٹنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ تخلیقی سطح پر بھی موثر اور معنی خیز ہیں ...... صابر وسیم اور مبین مرزا صاحبان اگر ایسوں کو بھی عسکری مخالف بنانے پر تل گئے ہیں تو انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پھر اس نقادِ اعظم کے حامیوں میں انہی کی سطح کے لوگ رہ جائیں گے۔ کیا خود صابر صاحب اور مبین صاحب اس سے زیادہ شرم ناک منظر کا تصور کر سکتے ہیں؟

یوں تو ''متعصب گفتگو پر ایک نظر'' میں صابر وسیم صاحب نے یا تو الزامات لگائے ہیں یا پھر بچاؤ بچاؤ کا شور مچایا ہے، لیکن کہیں کہیں اپنی تنقیدی بصیرت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ ذرا دو جملے ملاحظہ فرمائیں:

''......عسکری صاحب کے دوسرے دور کے متعلق احمد جاوید فرماتے ہیں کہ ''دوسرا مرحلہ وہاں آتا ہے جہاں وہ ذوق کو فہم کی بنیاد بناتے ہیں......'' (ص ۳۰۵)

''ابتدا میں تو تھیسس یہ بُنا گیا تھا کہ عسکری صاحب نے فہم کی بنیاد پر ذوق کو استوار کیا'' (ص ۳۰۷)

'ذوق = اساسِ فہم' اور 'فہم = اساسِ ذوق' کا یہ تضاد کاش! میری یا کمپوزر ہی کی حماقت اور جہالت کا نتیجہ ہوتا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔ ہمارے فاضل دوست نے اس تضاد کو میرے سر منڈھ کر جو لنکا ڈھائی ہے، اُس کا جائزہ آگے چل کر لوں گا۔ انشاء اللہ۔

لگتا ہے صابر وسیم صاحب کے دماغ میں یہ خیال بھس میں سوئی کی طرح گھس گیا ہے کہ قیصر عالم، احمد جاوید اور آصف فرخی کو عسکری صاحب سے کوئی پرانی کد ہے جس کا باقاعدہ اظہار پہلی مرتبہ اس گفتگو میں ہوا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ہم تینوں اپنی صفائی میں ایک بیان حلفی تیار کریں اور ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔

ہاں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم لوگوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں عسکری صاحب کو ''بڑا جاہل'' کہا ہے۔ استغفر اللہ۔ کوئی ان سے کہے کہ بھائی! یہ خطاب تو ہم نے مبین مرزا اور آپ کو بھی نہیں دیا، حالاں کہ ہر جواز موجود ہے۔ اس بہتان کے ثبوت میں میرا یہ فقرہ پیش کیا گیا ہے کہ

"عسکری صاحب محسوسات کے آدمی تھے۔" موصوف نے اس میں 'صرف' کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔
اب بتائیے عقل بڑی کہ بھینس۔ بقول کسے میرا جواب ہے: بھینس۔

غرض کس کس بات کا رونا رویا جائے۔ پوری دیانت اور ذمّے داری سے کہہ رہا ہوں کہ صابر وسیم صاحب ہوں یا مکرمی مبین مرزا، اُس گفتگو پر تنقید تو دور کی بات ہے، اسے سمجھنے کی انتہائی مبتدیانہ اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ اس معاملے میں دونوں خلقتہً معذور ہیں۔ انہیں چاہیے کہ اس مستقل عذر کو مزید نظر انداز نہ کریں۔ کوئی اور مشغلہ اختیار کرلیں۔ اس خود فریبی سے نکل آئیں کہ ان کا علم و ادب سے کوئی تعلق ہے یا کبھی ہوسکتا ہے۔ سیاہی از حبشی کے رود کہ خود رنگ است۔ کاش ان کے دوستوں میں کوئی اتنا تو ہوتا کہ ان سے کہہ سکتا کہ میاں ان چکّروں میں نہ پڑو، مفت کی خواری سے فائدہ!

اُدھر مبین مرزا صاحب کا مضمون "محمد حسن عسکری: نیا مطالعاتی تناظر" نسبتاً غنیمت ہے۔ اُن کی نثر بھی صابر وسیم صاحب کے مقابلے میں بہتر ہے۔ البتہ کم فہمی میں دونوں کم و بیش برابر کے ہیں۔ "مکالمہ" ۸ میں شائع ہونے والے اس مضمون کے چودہ پندرہ صفحات میں چار پانچ ہماری گفتگو پر ہیں۔ ہمیں عسکری مخالف قرار دینے کے بعد اُس مکالمے کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:

"یہ گفتگو از اوّل تا آخر مختلف النوع تضاد بیانیوں سے معمور اور بے دلیل اور پادر ہوا قسم کے اعتراضات سے بھری ہوئی ہے۔"

"اس کے شرکا کی کسی نکتہ آفرینی کا جائزہ لیا جائے، اس میں کوئی نہ کوئی ایسا بیان ملتا ہے جو خود انہی کے خلاف منحرف گواہ کا کام کرتا ہے۔"

اگر بات ان دعووں تک ہی محدود رہتی تو شاید کچھ پردہ رہ جاتا، لیکن موصوف نے ان کے حق میں کچھ مثالیں پیش کرکے اپنی بے مائیگی کو بالکل ہی عیاں کر ڈالا۔ مثال کے طور پر فکر اور محسوسات والے قضیے میں انہوں نے بڑی اچھل پھاند مچائی ہے۔

اُن کی ایک ایک بات کا جواب دوں گا۔ طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے کوئی رفتنی و گفتنی عبارت نقل کروں گا، پھر اپنی اخلاقی اور ادبی ذمے داری انجام دوں گا۔

O

"...... وہ لوگ بھی کم فعّال نہیں جن کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ Pro

عسکری ہیں۔ ایسے ہی افراد کی ایک گفتگو شائع ہوئی تو واضح ہوا کہ وہ لوگ Pro عسکری نہیں بلکہ اینٹی عسکری ہیں۔''

یہ 'پروعسکری' اور 'اینٹی عسکری' کی تراکیب ہی بتا رہی ہیں کہ متکلم کی ذہنی اور ذوقی سطح، بناوٹ اور اُفتاد کیا ہے۔

''اس گفتگو میں عسکری صاحب کے بارے میں جن خیالات و افکار کا اظہار کیا گیا ہے، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ......

۱۔ محمد حسن عسکری فکر کے نہیں، محسوسات کے آدمی ہیں۔

۲۔ فاعلی جہت کی بجائے انفعالی جہت پر زور دینے والے تاثر پرست ہیں۔

۳۔ وہ شعر کو محسوس تو کرتے ہیں، سمجھتے نہیں۔

۴۔ غالب اور اقبال ایسے فکری شعرا کو وہ اسی لیے own نہیں کرتے۔ appreciate نہیں کرتے کہ اُن کے یہاں فکر اور نظریہ غالب ہے۔

۵۔ میر کی محسوساتی شاعری اگرچہ اُن کے محسوساتی سانچے میں fit بیٹھتی ہے لیکن وہ میر کی تفہیم کے بھی تمام تقاضے پورے نہیں کرتے۔

۶۔ وہ تخلیقی تجربے کو نہیں سمجھتے، اُس کی ماہیت کو بھی نہیں کھولتے، محض اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔

۷۔ وہ غالب پر، اقبال پر کلام نہیں کرتے، اُردو کے پانچ چھ بڑے شاعروں کی بابت ہمیں کچھ نہیں بتاتے۔

۸۔ ادب میں ردّوقبول کے پیمانے وہ خود اپنے ہی تعصبات کی روشنی میں بناتے ہیں اور اپنے تعصبات کا شدت سے اسیر ہونے کے باعث بدذوقیاں پھیلاتے ہیں۔

۹۔ اُن کی تشخیص درست مگر تجویز مضحکہ خیز ہے، وہ بیل تو پورا بناتے ہیں لیکن دُم شیر کی لگا دیتے ہیں۔

۱۰۔ وہ اپنے ادبی کیریئر کے دوران وقتاً فوقتاً مختلف دکانوں سے نفسیات، تہذیب اور میٹا فزکس کے تھیلے خریدتے رہے اور تھیلوں کے اسی انتخاب کی وجہ سے رُسوا ہوئے۔''

مرزا صاحب نے عسکری صاحب پر ہماری تنقید کا یہ خلاصہ گو کہ ہمارے ہی الفاظ میں یا ہمارے ہی لفظوں کو جوڑ کر نکالا ہے، لیکن وہ اور باتوں کی طرح اس سے بھی ناواقفِ محض ہیں کہ تفصیل کو اجمال میں ڈھالنے کے کچھ قاعدے اور ضابطے ہوتے ہیں۔ انہیں ملحوظ نہ رکھنے والا یا تو نادان ہوتا ہے یا بددیانت۔ میں مبین مرزا صاحب کو بددیانت کہنے پر تیار نہیں ہوں۔ بہ ہر حال توضیحات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ''عسکری، فکر کے نہیں، محسوسات کے آدمی ہیں۔'' جی ہاں، میری رائے یہی ہے کہ عسکری صاحب فکر کے آدمی نہیں تھے۔ وہ مفکّر تھے نہ فکری امور سے وہ مناسبت اُن کے ہاں نظر آتی ہے جو کسی بھی بڑے نقاد میں یقیناً موجود ہوتی ہے۔ فکر کو فلسفیانہ معنی میں نہ لیا جائے تو بھی ایک زبان کی ادبی تنقید کی روایت میں سب سے اونچا مرتبہ رکھنے والے شخص سے یہ توقع رکھنے کا ہر جواز موجود ہے کہ وہ کسی تھیوری کا بانی ہوگا، ورنہ کسی تھیوری میں اتنا دخیل تو ضرور ہوگا کہ اس کی تشکیل و تکمیل کے بعض اہم ترین مراحل اس نقادِ اکبر کے اُن تصورات کی بنیاد پر طے ہوئے ہوں گے جو اپنی ماہیت میں جمالیاتی ہونے کے ساتھ ساتھ نظری بھی ہوتے ہیں۔ عسکری صاحب اس توقع کے کسی ایک جُز پر بھی پورے نہیں اُترتے۔ انہوں نے کوئی تھیوری نہیں دی، اور اُن کے ہاں ایسے تصورات بھی ناپید ہیں جو کسی تھیوری کی تکمیل یا تاسیس میں درکار ہوتے ہیں۔ وہ ایک مضبوط تھیوری کے ترجمان ضرور ہیں مگر یہ ترجمانی زبان سے زیادہ تعلق رکھتی ہے، دماغ سے کم۔

عسکری صاحب جس تصورِ روایت کا زبان، تہذیب اور ادب پر اندھادھند اطلاق کرتے ہیں، وہ اپنی اصلیت میں شاہین ہوگا مگر ان کے ہاتھ لگ کر بٹیر بن گیا ہے۔ وہ اس کے عقلی جوہر اور جمالیاتی روح تک رسائی نہ رکھنے کے باعث اسے اتنا Mechanical، یک رُخا اور سپاٹ بنا دیتے ہیں کہ شعور اپنی کسی بھی جہت سے اس کو اپنا بنیادی اور مرکزی موضوع بنانے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ اس تصور کو جہاں بھی بیان کرتے ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ آموختہ سنا رہے ہیں۔ روایت کی اصولی وحدت اور مظاہری کلیت کے مبحث میں اُن کا اندازِ نظر مورخانہ اور محققانہ ہے۔ وہ اصول کو، بہت زور لگاتے ہیں تو Historicize کر کے رہ جاتے ہیں۔ حقیقت اور اُس کے مظاہر کے تعلق میں ایک معنوی تنوع اور جمالیاتی تہ داری ہوتی ہے، جو حرکت و تغیر کو بامعنی بناتی ہے۔ عسکری صاحب اس اصول سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ادب میں اس کی applicabitity کا کوئی ایسا قرینہ نکالنے میں ناکام رہے جو ادبی روایت کی تشکیل کے مستقل اور مسلّمہ عناصر سے

متصادم نہ ہواور جمالیاتی شعور کے فطری اقتضا پر پورا اترتا ہو۔ روایت کی ادبی (اور تہذیبی) Manifestation کی حقیقی نوعیت کو دریافت نہ کرسکنے کا واحد سبب یہی ہے کہ عسکری صاحب فکر کے آدمی نہیں تھے۔ اُن کی نکتہ پردازی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سے بڑے بڑے معنی نکالنے کا مظاہرہ، دراصل اس محرومی کو چھپانے کی ایک تکنیک تھی جس میں وہ یہاں تک کامیاب رہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی ایسے درّاک اور صاحب علم نقاد بھی اس غلط فہمی یا خوش اعتقادی میں مبتلا ہیں کہ ''عسکری صاحب کا کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس میں کوئی باریکی فکر نہ ہو......''

میں بعض پہلوؤں سے فاروقی صاحب کو انتہائی منفرد اور مستند نقاد سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اُردو تنقید کے چند مستقل نقائص کا ازالہ کیا ہے۔ عملی تنقید میں تو وہ ماشاء اللہ اپنی ذات میں ایک دبستان ہیں، لیکن معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ یہ باریکیِ فکر، والی بات کچھ جچی نہیں۔ جن باریکیوں کو انہوں نے کھولا ہے، کھلنے کے بعد بھی ان میں فکر کا رنگ نہیں پیدا ہوا۔ یہ حسی اور ذوقی امور ہیں جن کی بیش تر معنویت قاری اساس ہے، اور اُس کاریگری کا کرشمہ ہے جو عسکری صاحب پر ختم ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے ہاں ایسے نکتے بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں وہ باریکی اور گہرائی موجود ہے جسے گرفت میں لانے کے لیے مطالعہ اور ذہانت بھی درکار ہے، لیکن مطالعے اور ذہانت کے بغیر منکشف نہ ہوسکنے والی ہر بات ضروری نہیں کہ فکر کی قبیل سے ہو اور معیاری تفکر کا نتیجہ ہو۔

عسکری صاحب کے ساتھ بڑا مسئلہ یہی تو ہے کہ روایت کے مابعد الطبیعیاتی اور عرفانی اصول کو کہیں منطبق یا وارد کرتے وقت جب وہ کسی حکیمانہ گہرائی تک مار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس اصول کے ساتھ اُن کی وابستگی اوپری اور مصنوعی لگنے لگتی ہے۔ ''بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے''، ''اُردو کی ادبی روایت''، ''وقت کی راگنی'' وغیرہ میں یہ چیز افسوس ناک حد تک نمایاں ہے۔ اُن کی نکتہ آفرینی بے شک غیر معمولی ہے لیکن اس کی تہہ میں زیادہ تر ذہانت، پختگی ذوق، وسعتِ مطالعہ اور سب سے بڑھ کر حسنِ اسلوب کارفرما ہے۔ اس کا سیاق وسباق یا اردگرد کی فضا عموماً فکری نہیں ہوتی۔ عسکری صاحب کے نکالے ہوئے نکتے اُن ماقبل مراحل کا احاطہ نہیں کرتے جنہیں طے کیے بغیر محض ایسے نتائج کو فکر سے نسبت نہیں دی جاسکتی جو ایک Strurctural فکری افادیت تو رکھتے ہیں مگر اُن تک پہنچنے کا طریقہ وہ نہیں ہے جو تفکّر کا خاصہ ہے۔ اس بات کے ثبوت میں کوئی خاص حوالہ لانے کی ضرورت نہیں، اُن کا سارا کام اس پر شاہد ہے۔

یہاں تک پہنچ کر خیال آیا کہ یہ خط اشاعت کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے صابر وسیم صاحب اور مبین مرزا صاحب کے ہاتھ بھی پڑے گا۔ اس لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ فکر کا مطلب فکرمندی نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ میں آ جائے تو پھر انہیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ معنی خیزی کا ہر عمل ضروری نہیں کہ فکر ہی ہو۔ کسی متن کے بامعنی، توضیحی وتشریحی حتیٰ کہ استدلالی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فکری بھی ہو۔ ادب وغیرہ میں فکر کا مطلب ہے وہ ذہنی پیش رفت جو شعور کے جمالیاتی مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے ہو۔

شعور کے جمالیاتی مسلّمات ایک پہلو سے حسّی ہوتے ہیں اور دوسرے رُخ سے عقلی۔ ایک سے جمالیات کی آفاقیت ثابت ہوتی ہے اور دوسرے سے اُس معنی کا اثبات ہوتا ہے جو تصورِ حسن کی ذہنی تشکیل میں صورت پر ایک متوازن مگر حتمی غلبہ رکھتا ہے۔ معنی وصورت کی اس حسبِ مراتب یکجائی کا ادراک، شعور کی حسّی جہت میں formalize ہو جائے تو 'ذوق' ہے، اور یہی عمل عقلی جہت میں ہو تو فکر۔

جمالیاتی اصول، اجمال میں ذوقی ہوتے ہیں اور تفصیل میں نظری۔ ہمارے عسکری صاحب اجمال میں پکّے اور تفصیل میں کچّے ہیں۔ یعنی فکر کے نہیں، محسوسات کے آدمی ہیں۔

وہ اصول کو quote تو کر دیتے ہیں مگر خود اس اصول کو اپنی validity اور جواز کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اُن کی طرف متوجّہ نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اُن کے یہاں اصول کے اطلاق کے اکثر تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ زبان اور شعریات کا فنّی علم نہیں رکھتے اور معنی کی تخیلی اور تکنیکی ساخت سے بھی اُن کے ذہن کو زیادہ مناسبت نہیں ہے۔ تخلیقی تجربے کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں اُن کی یہ کمزوری ایک مستقل رکاوٹ ہے۔

اصول کا علم اپنی تفصیل یعنی اطلاق میں، مظاہر کا علم ہے۔ کسی متن کو روایت کا مظہر بناتے ہوئے ضروری ہے کہ اُس کی ترکیب کے تمام عناصر کو، جن میں فنّی عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، نظر میں رکھا جائے۔ ورنہ اُس متن میں کسی مستقل اصول کا مظہر بننے کی صلاحیت کا پورا تعین ممکن نہ رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شعر مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے روایتی ہو، مگر اُس کی بناوٹ کا کوئی جز ایسا نکل آئے جو اسے روایتی کہنے میں مانع آ جائے۔

یہاں ذرا سا رُک کر ان دو شعروں کو دیکھ لیجیے جن کے عسکری صاحب نے روایتی معنی نکالے ہیں:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

(داغ)

وصل ہوجائے ابھی، حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اُٹھا رکھا ہے

(امیر مینائی)

عسکری صاحب پہلے شعر کے بارے میں فرماتے ہیں: ''کیا اس شعر کا ظہور اور خفا کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں؟'' دوسرے کے لیے ارشاد ہوتا ہے: ''کیا یہ شعر رویتِ باری تعالیٰ کے مسئلے سے نہیں نکلا؟''

ہم کہتے ہیں بالکل ایسا ہی ہے لیکن یہ شعر اُس روایت کے نمائندے نہیں ہو سکتے جس میں ظہور وخفا اور رویتِ باری کے تصورات کسی عقلی مابعد الطبعیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ دین اور قانون کی اساس پر اُستوار ہیں۔ یہ تصورات جہاں بھی اور جس طرح بھی بیان ہوں گے، ان کا مشارٌ الیہ ایک ہی ہوگا: اللہ۔ ورنہ وہ بیان خواہ کتنے ہی روایتی قرائن رکھتا ہو، روایتی نہیں کہلائے گا۔

اب ذرا دیکھیں، داغ کا شعر جس تمسخر اور تماش بینی پر چیخ چیخ کر دلالت کر رہا ہے، وہی یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اس منظر کا مرکزی کردار اللہ میاں نہیں ہو سکتے۔

یہی حال امیر مینائی کے شعر کا ہے۔ ایک تو اس کا سوقیانہ پن، اور اوپر سے شکایت بلکہ ڈپٹنے کا انداز! کیا اسی سے طے نہیں ہو جاتا کہ مشارٌ الیہ اللہ نہیں ہے۔ نہ بالقصد نہ بلاقصد۔

حیرت ہے، اتنی سامنے کی چیزیں عسکری صاحب کی نگاہ سے اوجھل رہ گئیں۔ سارا قصہ بس اتنا سا ہے کہ شدتِ طلب، مطلوب کو Divinize کر دیتی ہے، اس کا تشخص بدلے بغیر۔

اصل میں عسکری صاحب کو چیزوں کی دُم سے دُم باندھنے کا بہت شوق ہے۔ اُن کی نکتہ پردازی زیادہ تر اسی شوق کا نتیجہ ہے۔

ایک تو موصوف کا تصورِ روایت ہی نہیں بلکہ تصورِ دین بھی سر سے پاؤں تک، لفظ بہ لفظ School of Tradition سے ماخوذ و مستعار ہے، مزید ستم یہ کہ اس کی بھی ادبی اور تہذیبی Application میں وہ اُس فکری صلاحیت کا ثبوت نہیں دیتے جو اُن کے مرتبے کا لازمی تقاضا ہے۔ ہر معاملے میں نرے زور زبردستی اور رعب اندازی سے کام نہیں چلتا۔

اس بات کو ٹھیک سے سمجھنا ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اور کچھ نہیں تو آنند کمار سوامی ہی کی ایک آدھ چیز دیکھ لے۔ خود دیکھ لے گا کہ اُردو کا سب سے بڑا نقاد اور تصورِ روایت کا امام کتنے پانی میں ہے۔ لیکن چوں کہ صابر صاحب اور مرزا صاحب اس گزارش کی پذیرائی کرنے سے معذور ہیں، لہذا اس مسئلے کو قدرے تفصیل سے دیکھنا پڑے گا۔

عسکری صاحب جس حقیقتِ واحدہ کو بنیادی روایت مانتے ہیں، ظہور و شہود کی جہت سے اس کے تین تعینات ہیں: حق، خیر اور جمال۔ ظہور کا دائرہ مرتبہ واحدیت سے لے کر تمام کائناتی اور انسانی مراتبِ وجود کو محیط ہے۔ اس دائرے میں موجود اور معلوم ہونے کی یہی تین بنیادیں ہیں۔ ہر موجود اور معلوم شے حق سے قائم، خیر پر مبنی اور جمال کا مظہر ہے۔ لیکن حق، خیر اور جمال، موجودات کے امورِ ذاتی نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت جوہر کی سی ہے، اور ہستی کا انسانی اور کائناتی احوال گویا عرض (Accident) ہے۔ ان جواہرِ ثلاثہ کے اعراض کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں جو دائرۂ ظہور میں وجود اور علم کی وحدت اور امتیاز کے یکجا اور جداگانہ تحقق (Realization) کو شعور کی تمام انواع کے لیے ان کے لیے اپنے اپنے Paradigm میں ممکن بناتی ہیں۔ انھیں حسبِ ضرورت مختلف عنوانات دیے جا سکتے ہیں: عقلی اور حسی، ذہنی اور خارجی، کلی اور جزئی، ابدی اور آنی، انفسی اور آفاقی، ساکن اور متحرک، تام اور ناقص وغیرہ۔ حق، خیر اور جمال کو گویا مستقل مدلولات سمجھنا چاہیے، اور تمام چیزیں..... موجود ہوں معلوم، انفسی ہوں یا آفاقی —— علیٰ ہذا القیاس انھی کی دلالتیں ہیں جن میں باہم مطابقت بھی ہو سکتی ہے اور تضاد بھی۔

اس پورے نظام سے ہم آہنگ رہنے کے لیے انسان کو ایک سہ جہتی شعور یا شعور کی تین انواع ودیعت ہوئی ہیں: عقلی، اخلاقی اور جمالیاتی۔ حقیقت اور اس کے مظہر کی مختلف نسبتیں اپنے امتیازات کے ساتھ ان پر منکشف ہوتی ہیں۔ اس انکشاف میں حقیقت کا استحضار غالب ہو تو یہ شعور عقلی ہے، حقیقت و مظاہر دونوں حسبِ مرتبہ امتیاز کے ساتھ ملحوظ رہیں تو یہ اخلاقی شعور ہے، اور مظاہر کا حضور (Presence) غلبہ پکڑ لے تو یہ جمالیاتی شعور ہے۔

ظہورِ حقیقت اور اس کے شعور کے یہ تینوں احوال اپنی اصل اور منتہا کے اعتبار سے ایک ہیں۔ تاہم باہمی امتیاز کی حالت میں بھی ان میں ہر ایک اپنی اپنی جگہ Anthentic ہے۔ مثلاً عقلی شعور اگر جمالیاتی شعور سے منفرد، ممتاز بلکہ منقطع ہو جائے تو بھی اس کے حاصلات خواہ ناقص رہ جائیں، مگر رہیں گے Valid۔ بس شرط یہ ہے کہ ظہور و مظاہر کی اصلی اور عام نسبت محو یا مجروح نہ ہو۔

مدلول ایک ہو تو دلالت کی ہر نوع، بلاشرکتِ غیرے، ناقص تو ہے مگر اُس کا حقیقی ہونا برقرار رہتا ہے۔ اس کی دلیل، مجموعی شعور کے مسلّمات کی روشنی میں، خود وہ شعور فراہم کرتا ہے جس کا وہ دلالت، معروض ہے۔ یہ دلیل، جس میں اپنی self-transcendence کی استعداد کے باعث، شعورِ عقلی بھی شریک ہوتا ہے، اُس شعور کی داخلی منطق اور ذاتی مقصود، یعنی حق، خیر اور جمال میں سے کسی ایک کے تابع ہوتی ہے اور اسی پر مبنی۔

ہر شعور اپنا منفرد طریق حصول اور اسلوبِ حضور رکھتا ہے جو آپس میں متصادم بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تصادم ایک کو روایتی اور دوسرے کو غیر روایتی قرار دیے جانے کا سبب نہیں بنتا۔ کیوں کہ یہ اعتبارات ہیں۔ جب تک ان کا اعتبار ہونا یعنی حقیقت کی نسبت پر قائم ہونا ثابت ہے، ان کی ہر صورت روایتی ہے، یا یوں کہہ لیں کہ غیر روایتی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر، حقیقت اور مظاہر کے مسئلے میں وحدت و کثرت ایک ناگزیر حوالہ ہے۔ عقلی شعور وحدت کو حقیقی اور کثرت کو غیر حقیقی کہتا ہے، اخلاقی شعور کی رو سے اپنے اپنے مرتبے میں دونوں حقیقی ہیں...... ادھر جمالیاتی شعور حقیقی اور غیر حقیقی کی تقسیم ہی نہیں رکھتا۔ اس کی نظر میں کثرت، وحدت ہی ہے مگر خود وحدت، کثرت نہیں ہے۔ بقول بابا فغانی:

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرّہ عینِ اوست
امّا نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

اسی طرح وجود کا مسئلہ لے لیں۔ شعورِ عقلی اس کی وحدت، شعورِ اخلاقی، اثنینیت اور شعورِ جمال، مشہودیت کا قائل ہے۔

غرض حقیقتِ واحدہ کے بارے میں تینوں کا حتمی موقف اور کلّی تصور ایک دوسرے سے جدا ہو کر بھی اُس کے ساتھ اپنی نسبت میں Valid ہے۔ ایسا نہ ہو تو مجموعی شعور جو ان تینوں کی ہیئتِ وحدانی ہے، معدومیت کی دُھند میں پڑا رہے۔ یہ مجموعی شعور جو ان کے یک جان ہونے کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی، اپنی مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہی حق، خیر اور جمال کے اصول کو اُن کے متعلقہ شعور کے اقتضا اور مطلوب کے طور پر قبول کرتے ہوئے ان کی اصلی وحدت کو بھی اس طرح محفوظ رکھتا ہے کہ عقل و اخلاق وغیرہ اپنے بنیادی دعوے اور باہمی امتیاز سے دست بردار ہوئے بغیر، حفظِ وحدت کے اس عمل میں شریک رہتے ہیں۔

عسکری صاحب کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ادب کے ذریعے سے روایت تک پہنچے اور

اے ایک غیر متوازن انداز سے ادب پر منطبق کرنے لگے۔ روایت تک پہنچنے کے دو معیاری طریقے، عقل اور جذبہ، اُن کی دسترس میں کبھی نہیں آئے۔ وہ صرف معمول کے جمالیاتی شعور میں پھنس کر رہ گئے۔ جو تاثر کو بامعنی بنا کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس شعور میں اُس شہود کی سرے سے سائی نہیں ہے جو روایتی شعورِ جمال کا فطری خاصّہ ہے۔ مابعد الطبیعیات کا شعور تو دُور کی بات ہے، اگر عسکری صاحب میں اعلیٰ درجے کی ادبی بصیرت بھی ہوتی تو 'روایت' اور ادب میں کھونٹے اور گائے کی نسبت دیکھنے سے محفوظ رہتے۔ ادب میں روایتی بننے یا ہونے کی ایک داخلی قوت ہوتی ہے۔ اُس پر قانونِ فوجداری لگانا ازروئے روایت بھی مضحکہ خیز ہے۔

وہ مجموعی شعور جس کا بنیادی فعل تفکّر ہے اور حاصل، معرفت، عسکری صاحب کی رسائی سے باہر رہا۔ وہ روایت کی جزوی اور یک رُخی application پر مجبور ہیں، اور اس discourse کو لفظ ومضمون اور قول وفہم کی ادنیٰ نسبت سے اوپر لے جانے پر قادر نہ ہو سکے۔ کہیں کہیں زور لگاتے ہیں، مگر اس طرح کہ دیکھنے والے کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ہنسے یا ترس کھائے۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مثلاً یہ عبارت جو بغیر کسی کاوش کے منتخب کی گئی ہے۔

۱۔ ''مشرق میں ہر چیز کی اضافی اہمیت اور قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اُس کا تعلق حقیقت کے کس درجے سے ہے۔ اگر کسی چیز کا تعلق بیک وقت کئی درجوں سے ہے۔ تو ہر درجے میں آ کر اس کی قدر و قیمت بھی بدل جائے گی، ایک سی نہیں رہے گی، حالاں کہ وہ چیز اپنی جگہ جوں کی توں رہے گی۔ یہی حال لفظوں کا ہے۔ مشرق میں ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ مثلاً ''ذات'' کا ہی لفظ لیجیے۔ دراصل ہمارے یہاں یہ لفظ صرف خدا کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن جب یہ لفظ ظہور کے درجات کی سیڑھیوں پر نیچے اترنے لگتا ہے تو آخر میں آپ یہ فقرہ بھی سنتے ہیں: ''کتّے کی ذات''۔ (''مشرق و مغرب کی آویزش'')

یہ اور اس کے آگے پیچھے کی پوری عبارت غلطیوں اور بے احتیاطیوں کی پوٹ ہے۔ اوّل تو یہ تصوّرِ روایت اپنی صحیح شکل میں بھی دین اور دینی شعور سے بُری طرح متصادم ہے، لیکن عسکری صاحب نے تو اسے بازیچۂ اطفال ہی بنا کر رکھ دیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ ادب بازی کے چکّر میں کچھ نہیں سمجھے۔

موصوف نے 'حقیقت' سے مراد لی ہے: ''حقیقت عظمیٰ''۔ جو اُن کے الفاظ میں (۱) بنیادی حقیقت ہے (۲) ازلی الظہور اور ابدی الخفا ہے (۳) ہر قسم کے تعینات سے ماورا ہے (۴) ظہور کے دائرے سے بھی اوپر ہے (۵) الفاظ میں اُس کا بیان بھی نہیں ہوسکتا (۶) حقیقتوں کے درجات کے لحاظ سے اسلامی اصطلاح میں اسے عالم لاہوت کہا جاتا ہے (۷) ظہور کے دائرے سے بالاتر ہے لیکن ظہور بھی اختیار کرتی ہے، اسی لیے حقیقت (عظمیٰ) کے کئی درجے ہوجاتے ہیں۔

اب ذرا اس پورے بیان کی technical غلطیاں ملاحظہ ہوں:

۱۔ حقیقت جو ماورائے ظہور اور ہر قسم کے تعینات سے بلند ہے، ذاتِ الٰہیہ ہے۔ ذات کا ظہور محال ہے ورنہ اس کا اثبات سلبی نہیں رہے گا، عینی ہوجائے گا۔ یعنی اُس کے بارے میں ''یہ بھی نہیں،'' وہ بھی نہیں، کا قول بے معنی ہوجائے گا اور اس کا ادراک جزوی طور پر ہی سہی مگر ممکن ہوجائے گا۔

۲۔ ماورائے ظہور و تعینات ہونا امر ذاتی ہے جب کہ ظہور اختیار کرنا اور تعینات قبول کرنا امر صفاتی۔ ایسا نہیں جو ذات ماورائے ظہور ہے وہی آمادۂ ظہور بھی ہے۔

۳۔ ظہور اور حقیقت ہم معنی نہیں ہیں۔

۴۔ ایک چیز حقیقت کے کئی درجوں سے متعلق نہیں ہوسکتی یہ خیال ہی لغو ہے۔ شے کو متعدد الحقائق جاننا نادانی ہے...... ہاں اگر چیز یعنی موجود کی بجائے وجود کہتے تو ازروے روایت غلط نہ ہوتا۔

۵۔ موجودہ مبحث میں چیز اور لفظ کو یک حال کر دینا غلطی کی وہ قسم ہے جسے صابر وسیم صاحب اور مبین مرزا صاحب سے تو بلاتکلف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن اُس کی نسبت عسکری صاحب کی طرف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ظہور اور ظہور کے ادراک و اظہار کے میڈیم میں فرق نہ کرنا کسی ناواقفِ مطلق ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔

۶۔ ''خدا کی ذات'' سے نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ''کتے کی ذات'' تک کے درجات ظہور میں عسکری صاحب کی منطق کے مطابق ذات جوں کی توں رہے گی۔ سوال یہ ہے کہ کون سی ذات؟ اصلی یا اضافی! ''ظہور کی سیڑھیوں پر سے اُترنے'' کا عمل ظاہر ہے کہ اضافہ کا تو کام نہیں ہوسکتا۔

۷۔ ''ذات'' کا لفظ ''ظہور کے درجات کی سیڑھیوں پر نیچے اُتر کر'' خدا سے معاذ اللہ کتے پر آ نکلتا ہے! اس بدترین غلطی کا تجزیہ کرنے کے لیے جو ہمت چاہیے، یہ ناچیز اس سے محروم ہے۔ بس

اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ، عسکری صاحب کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ یہ ہے اُن کا سب سے بڑا کارنامہ اور اس کی اوقات۔

۸۔ظہور کی غایت چیزوں کی معدومیت کا اظہار ہے نہ کہ اُن کے موجود ہونے کا اثبات...

اس عبارت کی کچھ غلطیاں یہ اصول نہ جاننے کا نتیجہ ہیں۔

غرض عسکری صاحب نے جہاں بھی مابعد الطبیعی اصول کے بیان میں اپنی بولی بولنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ بات وہ خود بھی سمجھتے تھے، اسی لیے جگہ جگہ، غلط بات میری اور صحیح میرے امام کی، والا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ معتقدین بچارے اسے اُن کے انکسار پر محمول کرتے ہیں۔ اُن کا یہ مستقل انداز ہے کہ عارفانہ تصوف (جسے فاروقی صاحب تعقلی تصوف کہتے ہیں) اور Esoterism کے صحیح یا جعلی نمائندوں کے بیانات تو نقل کر دیتے ہیں مگر اُن پر ٹک کر کلام نہیں کرتے۔ اُن بیانات کا ایک معمولی سا مصرف نکال کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ روایتی لوگوں کی طرح ان کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ عسکری صاحب کے ہاں فکر وتفکّر کا خانہ خالی ہے۔ اس خانہ خالی میں بالآخر رینے گینوں نے ڈیرا جمالیا۔

دیو ہر کس بقدرِ خانۂ اوست

موقع نہیں ورنہ الامام الشیخ عبدالواحد یحیٰی المعروف بہ رینے گینوں کے تصورِ روایت کو بھی دیکھ لیتے۔ سرِ دست ایک جملہ روایت بالمعنی کے طور پر نقل کرتا ہوں جو انہی کے ہم خیالوں کے قلم سے نکلا ہے: ''رینے گینوں کے یہاں نبوّت کا تصوّر نہیں ہے''...... ایک رینے گینوں ہی کیا پورے دبستانِ روایت کا یہی حال ہے۔ روایت کے اس تصور میں نبوت فطری طور پر ایک غیر ضروری چیز ہے۔

خیر۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ مقصود یہ دکھانا تھا کہ عسکری صاحب جس روایت کے Champion بنے ہوئے تھے، اس کے لیے اُن کے اندر کوئی فکری یا تعقلی اساس موجود نہیں تھی۔ اُن کا زیادہ تر کام قینچی کا مرہونِ منّت ہے اور باقی، خود ان کی اصطلاح میں، نری گدّے بازی ہے۔

''مشرق اور مغرب کی آویزش'' ہی میں ایک جگہ۔ بات تو ٹھیک ہے کہ شاعری کے ردّ وقبول کا مدار اُس ادبی معیار پر ہے جو روایت ہی کی دین ہے...... مگر یہ دو جملے دیکھیں، اناڑی پن اور کم

علمی پکار پکار کر اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہے:

''...... عالم کثیف کا پست ترین درجہ بھی بالاتر حقیقت عظمیٰ سے منسلک ہے۔ اس لیے کسی طرح کی حقیقت کو رد نہیں کیا جاسکتا۔''

اس دعوے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ عالم کثیف کا پست ترین درجہ اور عالم لاہوت، دونوں، تمام تر فرق کے باوجود، ذاتِ الٰہیہ سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو مکان ومکیں میں ہوتی ہے۔ اس تصور کی لغویت اور گمراہی ظاہر ہے۔ پھر ''بالاتر حقیقت عظمیٰ''، ''منسلک'' اور ''کسی طرح کی حقیقت''...... یہ کلمات غمازی کرتے ہیں کہ عسکری صاحب تنزّل وتعیّن کے روایتی تصور سے مانوس ہیں نہ باخبر۔

جناب والا، اس طرح کے اور بھی کئی حوالے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ''وقت کی راگنی''، ''بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے''، ''اُردو ادب کی روایت''، ''ابن عربی اور کیر کے گور'' اور ''ادب میں صفات کا استعمال''...... یہ مضامین خاص طور پر اس طرح کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر سوچتا ہوں کہ بات کو طول دے کر تھکنے اور تھکانے سے فائدہ! سمجھ دار کے لیے یہ دو تین نمونے بھی کافی ہیں اور ناسمجھ کے لیے پورا دفتر بھی نقل کر دیا جائے تو بے سود۔ سچ پوچھیں تو مجھے اب یوں لگتا ہے کہ روایت کی منزل تک پہنچنے کے لیے عسکری صاحب کا سارا سیر وسفر، اعصاب کے ارتعاش، سے شروع ہوا اور اعصاب کے سکون پر تمام ہوگیا۔

بات یہ ہے کہ متصوفانہ اور عارفانہ discourse خاصی نازک اور پیچیدہ چیز ہے۔ عسکری صاحب محض ایک محدود ادبی ذوق اور فہم کے بل پر اس میں کود پڑے۔ انہیں آخر تک یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ یہاں لفظ ومعنی کی بے شمار نسبتیں ایک دوسرے میں گتھی پڑی ہیں اور ہر نسبت نہایت دقیق ہے۔ نتیجتاً وہی ہوا جو تنکے کے بھروسے پر بھنور میں چھلانگ لگا دینے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

O

۲۔ ''(محمد حسن عسکری) فاعلی جہت کی بجائے انفعالی جہت پر زور دینے والے تاثر پرست ہیں''...... یہ جاہلانہ فقرہ اگر میں نے اب تک کی زندگی میں ایک بار بھی سوچا، بولا یا آج سے پہلے کہیں لکھا ہو تو مجھ پر اللہ کی لعنت۔ باقی مبین مرزا صاحب کو باری تعالیٰ یہاں بھی سایۂ رحمت میں رکھیں اور وہاں بھی۔ میں نے عسکری صاحب پر اپنی گفتگو میں ایک مقام پر یہ کہا تھا کہ ''محسوسات جب ہم کہتے ہیں تو یہ ہمارے تعلق کی جہت انفعال ہے۔ فکر جب ہم کہتے ہیں تو وہ ایک فاعلی جہت

ہے۔ عسکری صاحب چیزوں کے تعلق میں فاعلی جہت کو نہیں پسند کرتے، انفعالی جہت پر زور دیتے تھے۔'' دوسری جگہ یہ عرض کیا تھا کہ ''اصل میں ذوق کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ نقاد ذرا سا چوکے تو ذوق تاثر بن کر رہ جاتا ہے...... عسکری صاحب بھی جہاں چوکتے ہیں وہاں ذوق کو تاثر بنا دیتے ہیں......'' موصوف نے دونوں باتوں کو جوڑ کر، ذرا دیکھیے تو سہی، کیا نتیجہ برآمد کیا ہے۔ واقعی سلام کہنے کو جی چاہتا ہے۔

بھلے لوگو! فعل و انفعال Perception کے دو اصول ہیں۔ انہیں حصول و حضور بھی کہتے ہیں۔ ان میں فضیلت انفعال اور حضور کو حاصل ہے۔ میں نے عسکری صاحب کی بڑائی کی ایک بنیاد دریافت کی ہے، تم اس کو ان کی تحقیر بتا رہے ہو! خدا کی پناہ، اس لیاقت پر مضمون نگاری کی سوجھی ہے!

O

۳۔ ''وہ شعر کو محسوس تو کرتے ہیں، سمجھتے نہیں۔'' جن فقروں سے عسکری صاحب کے ان نادان دوستوں نے یہ مطلب برآمد کیا ہے، اُن کی نشان دہی آگے چل کے کر دی ہے۔ میں اپنا جواب اُس مقام پر پہنچ کر پیش کروں گا۔ سرِدست یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں: اعوذ باللہ اُن اکون من الجاھلین۔

O

۴۔ ''غالب اور اقبال ایسے فکری شعرا کو وہ اسی لیے Own نہیں کرتے، appreciate نہیں کرتے کہ اُن کے یہاں فکر اور نظریہ غالب ہے......''

بالکل صحیح۔ میری یہی رائے ہے۔ میں اس کی تفصیل ''شب خون'' والی گفتگو میں کر چکا ہوں۔ تو ہے ابھی ہوش میں، میرے جنوں کا قصور!

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عسکری صاحب، غالب و اقبال کو پسند نہیں کرتے، مسئلہ یہ ہے کہ کیوں نہیں کرتے؟ میرے خیال میں اس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو وہی جو کم از کم اس خط کی حد تک میرا تکیہ کلام بن چکا ہے کہ وہ فکر کے آدمی نہیں تھے اور دوسرا تنگی ذوق۔ اُن کے ہاں فکر کی وہ قسم بھی مفقود ہے جو خود اُن کے تصورِ روایت کی ادبی اور تہذیبی تشکیل کے لیے درکار ہے۔ دوسری طرف، بعض تعصبات کو نکال کر، اُن کا ذوق تھا تو بے مثل مگر تکلیف دہ حد تک محدود۔

اب ان دو باتوں کی ذرا سی وضاحت:

'روایت' ایک بیان کی طرح ہے جس کے معنی لامحدود مگر متعین ہیں، اور معنویت محدود مگر غیر متعین۔ روایتی فکر یا تفکر، اس اصول کے شعور اور اطلاق سے عبارت ہے۔ اس کے بغیر یہ نکتہ واضح نہیں ہوسکتا کہ معنی اور معنویت میں وہی نسبت ہے جو مثال کے طور پر حقیقت اور صورت، تصور اور تصدیق، اجمال اور تفصیل، حضور اور حصول، سکون اور حرکت...... یہاں تک کہ غیب و شہود میں پائی جاتی ہے۔ 'روایت' کے دائرے میں فکر کا کام یہ ہے کہ معنویت، یعنی معنی کے ادراک، انعکاس اور اطلاق کے مسلسل عمل میں ایک فعّال عنصر کی حیثیت سے شریک رہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ معنی جو تصوّر سے مشابہ ہے، اس کے تصدیقی حدود اور امکانات میں اضافہ کرتی رہے۔ بالفاظ دیگر، معنویت کا پھیلاؤ بڑھاتی رہے، اُس کے غیر متناہی امکانات explore کرتی رہے...... ذہن میں بھی اور فی الخارج بھی۔ گویا فکر معنویت کے مصداقات دریافت تو کرتی ہی ہے، ایجاد بھی کرتی ہے۔

ادھر عسکری صاحب کے ہاں یہ دریافت و ایجاد اگر کہیں ملتی بھی ہے تو وہ دوسروں کی ہوتی ہے۔ اُن کی کوٹھی کا سب اناج منڈی کا ہے۔

باقی رہا تنگی ذوق کا مسئلہ، تو اس کی وضاحت کے لیے اجازت ہو تو اوپر کہی ہوئی بات کو تھوڑا سا بدل کر دُہرا دوں۔ روایت ایک بیان ہے جس کے معانی، مخاطب میں منتقل ہو کر دو صورتیں اختیار کر لیتے ہیں: مفہوم اور تاثر۔ (یہاں سلسلۂ کلام معطّل کر کے حفظ ماتقدم کے طور پر مبین مرزا صاحب سے گزارش ہے کہ یہ تاثر وہ نہیں ہے جو آپ قسم کھا کر سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے اقبال کا یہ شعر پڑھیں، اور شعر کو سمجھنے کے لیے جمال بھائی سے رُجوع کریں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے:

دور ہوجاتی ہے ادراک کی خامی جس سے
عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

یہ دونوں الگ الگ رہ جائیں تو بے وقعت ہیں۔ محض مفہوم، ناقص ادراک ہے اور نرا تاثر، ادھورا احساس۔ ان کی ساری قدر و قیمت ایک دوسرے سے پیوستہ رہنے میں ہے۔ مفہوم اور تاثر ایک وحدت میں ڈھل جائیں تو یہی ذوق ہے۔ خیال رہے کہ یہ ذوق کی عمومی سطح ہے جو ادب وغیرہ میں درکار ہے۔ ٹھیٹھ روایتی ذوق عرفانی اور عشقی ہوتا ہے، اور عقل ہی کو نہیں بلکہ مجموعی شعور کو اپنے تابع رکھتا ہے۔ اس ذوق کی ماہیت بھی، ظاہر ہے، حسّی ہی ہوتی ہے، لیکن اس کے محسوسات

اور ادبی ذوق کے محسوسات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

عسکری صاحب ادبی ذوق اور ادبی محسوسات کے آدمی تھے۔ اور یہ کوئی شرمانے کی چیز نہیں۔ ہمارے نقادوں میں کوئی ایک بھی نہیں جو متن کے مفہوم اور تاثر کو ان کے کمال کے ساتھ یک جان کر دینے کا ایسا ملکہ رکھتا ہو۔ وہ جب کسی بے لچک فکری نظری موقف کی پابندی کا بوجھ لادے بغیر کوئی ادبی موضوع چھیڑتے ہیں تو، خود پر قیاس کرکے کہہ رہا ہوں کہ پڑھنے والا سانس لینا بھول جاتا ہے۔ اُس کا ذوق علیٰ حالہ برقرار رہتا ہے، نہ فہم۔

عسکری صاحب کو ٹھیک سے پڑھ لینے کے بعد بہت مشکل ہے کہ آدمی چیزوں کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کا وہی انداز نہ اختیار کرلے۔ قاری کو اندر سے بدل دینے کی ایسی قوت اُردو تنقید میں نایاب ہے۔ یوں تو ہماری تنقید ایک رینگنے والی مال گاڑی ہے جس کے اکثر ڈبے خالی پڑے ہیں۔ تاہم جیسا تیسا، جتنا مال ہے، اُس کا بہترین اور کارآمد حصہ عسکری نے بار کروایا ہے۔

اُن کے بعد لکھی جانے والی تنقید میں جتنا حصہ کام کا ہے، سارے کا سارا انہی کی اثر اندازی کا نتیجہ ہے۔ جو اُن کے بنائے یا بتائے ہوئے راستے پر نہیں چل رہا، وہ نقاد کہلانا qualify نہیں کرتا۔ محمد حسن عسکری کے اثرات کو اگر جادو کے زور سے غائب کر دیا جائے تو اُردو تنقید کی بیش تر عبارتیں ساتھ ہی اُڑ جائیں گی۔

یہ سب تو ٹھیک ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اُن کی بلند قامتی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بالشتیوں کے دیس میں پیدا ہوئے۔ یہ چیز اُن کے تمام کمالات کو گہنا دیتی ہے۔

مثلاً یہی ذوق کا قصہ لے لیں۔ اس معاملے میں وہ بے مثل ہیں مگر اس بے مثلی کا عرض بہت کم ہے۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں مگر بنیادی کردار ان چار کا ہے:

۱۔ تخیل سے عدمِ مناسبت، خواہ عقلی ہو یا جمالیاتی۔

۲۔ شکوہِ بیان اور نشاطیہ لہجے سے وحشت۔

۳۔ فنی رموز اور مسائل سے ناواقفیت۔

۴۔ رینے گینوں۔

شروع کے تین اسباب تو طبعی ہیں مگر رینے گینوں والی مصیبت خود آوردہ ہے۔ یہ شخص بنیادی طور پر اُس Symbolism کا ایک اہم نمائندہ تھا جو اپنی ماہیت میں ریاضی+منطق+توہماتی ہے۔ ہمارے یہاں اس کے امام عبدالکریم الجیلی ہیں جنھوں نے عسکری صاحب میں حلول کرکے

"بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے"، لکھوایا۔ رینے گینوں کا دامن پکڑ کر عسکری صاحب کی 'بے فکری' میں تو بظاہر کسی قدر کمی آ گئی لیکن ادبی self کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ فہم اور تاثر کی وحدت جو اُن کا مایہ امتیاز تھی، تقریباً دولخت ہوگئی۔ مضمون پر اُن کا زور اتنا بڑھ گیا کہ عملاً دوسرے پہلو ماند پڑ گئے۔

یہاں میں اس سوال کو نظر انداز کرتا ہوں کہ شعر کے مضمون کا تعلق شعور کے اُن contents سے ہے جو معتقدات و مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں، یا اسے محض قدرتِ کلام اور حسن اظہار کا مظہر جاننا چاہیے۔ یعنی مضمون شاعر کا نظریہ ہوتا ہے، یا الفاظ و اشیا پر اُس کی گرفت کا اظہار؟

فی الحال میری دلچسپی اس میں ہے کہ عسکری صاحب کے لائقِ رشک ذوق میں وہ کیا کمی رہ گئی تھی جس نے اُن کو غالب اور اقبال سے دور رکھا۔ اس مسئلے پر شمس الرحمٰن فاروقی نے بہت اچھی باتیں کی ہیں۔ مجھے اُن کی اس رائے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے کہ محمد حسن عسکری کے ادبی فیصلوں کی بنیاد عموماً غیر ادبی ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ اُن کے ذوق کی محدودیت تھی جو تصورِ روایت سے غیر مشروط وابستگی اختیار کر لینے کے بعد اور بڑھ گئی۔ وہ تصورِ روایت، جسے بعض لوگ غلط فہمی سے دینی سمجھتے ہیں، اتنا ریاضیاتی اور mechanical ہے کہ اس کی بنیاد پر کوئی ادبی اصول وضع کر بھی لیا جائے تو اس کی عملی حیثیت صفر ہوگی۔

میں نے "شب خون" والی گفتگو میں کہیں عرض کیا تھا کہ عسکری صاحب چیزوں کو contain کرنے کا مزاج رکھتے تھے۔ غالب و اقبال اور فارسی شعری روایت سے اُن کی دوری کا ایک سبب یہ احاطہ خوئی بھی ہے۔ وہ احساس کو تو گرفت میں لا سکتے تھے، لیکن تخیل اور تفکّر کا احاطہ اُن کے بس سے باہر تھا۔ یہاں محض حسن کلام اور نفاستِ ذوق ناکافی ہے۔

عسکری صاحب کے لیے میر پر ہاتھ ڈالنا بوجوہ آسان تھا۔ میر کا شعر اپنی داخلی اور ظاہری، معنوی اور لفظی ساخت میں ایک عجیب النوع غیر متناہیت رکھتا ہے جو شدتِ ارتکاز کا نتیجہ ہے۔ وہ معنی کو احساس اور احساس کو معنی بنا دیتے ہیں، اور اس تقریباً ناممکن عمل میں زبان پر اُن کی بے نظیر گرفت بھی بنیادی کردار رکھتی ہے۔ مناسباتِ لفظی کا ایسا شعور کہیں اور نہیں مل سکتا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ علم و وجود اور معقول و محسوس کی عینیت اسی شعور پر منکشف ہوتی ہے جو لفظ کو اپنا حال بنا سکے، اور الفاظ کی باہمی نسبتوں کا ہر پہلو، بہ تمام و کمال، اس کی دست رس میں ہو۔ میں شاید اس

بات کو ٹھیک سے کہہ نہیں پا رہا کہ وہ ظرف جہل دوئی، وحدت میں اور تضاد، عینیت میں ڈھل جاتا ہے، ذہن نہیں ہے بلکہ لفظ...... اُدھر میر کا یہ عالم ہے کہ پانی بھی اسی کا پیتے ہیں۔ جس مرتکز غیر متناہیت کا اوپر ذکر آیا ہے، وہ لفظ سے کامل وجودی ہم آہنگی کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتی۔

میر کا کوئی شعر لے لیں۔ معنی، محسوس پہلے ہوتے ہیں اور مفہوم بعد میں۔ کوئی ٹھکانا ہے اس کمال کا کہ معنی، ایک تخلیقی رو بن کر قاری کے ذہن نہیں، وجود میں سرایت کر جائے۔ اُن کے یہاں ایک ایسی پیچیدہ سادگی یا سادہ پیچیدگی ہے جو ذہن اور محسوسات دونوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس تجربے کا ادراک اور اظہار کرنے کے لیے قاری کو فکر سے زیادہ ذوق کی ضرورت ہے۔ وہی ذوق جو مفہوم اور تاثر کو ایک کر دیتا ہے۔ میر کا قاری بننے کی یہ ابتدائی مگر بنیادی ترین شرط اگر کوئی پوری کر سکتا ہے، تو وہ اپنے عسکری صاحب ہیں۔

یہ تقریر اس لیے کر دی ہے کہ کوئی نادان یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں غالب و اقبال کو میر سے بڑھانے جا رہا ہوں۔ ادھر تو یہ حال ہے کہ سعدی و حافظ کو میر پر فوقیت دی جائے تو بُرا لگتا ہے، غالب و اقبال تو چیز ہی کیا ہے۔

فردوسی کی مدح میں انوری کا مشہور قطعہ اگر بالفرض میر کی مدح میں ہوتا اور انوری ہی کے قلم سے نکلتا تو کم از کم ایک شخص اس پر بھی دریں چہ شک ہی کہتا:

آفریں بر روانِ فردوسی
آں ہمایوں نژاد فرخندہ
اُو نہ اُستاد بود و ماشاگرد
اُو خداوند بود و ما بندہ

O

بھائی میں کوئی نقاد یا ادیب تو ہوں نہیں۔ قلم بھی ٹھیک سے پکڑنا نہیں آتا، خیالات پر بھی قابو نہیں ہے۔ بات ابھی ڈھنگ سے شروع نہیں ہوتی کہ اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہوں۔ پھر اس خیال سے کہ یہ خط ہے، کوئی مضمون نہیں، آوارہ گردی کو جیسے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ بہ ہر حال اس دفعہ تو معاف کر دیں، آگے اللہ مالک ہے۔

میں یہ عرض کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عسکری صاحب اُس شاعری سے دور بھاگتے ہیں جس کی بنیاد تعقلی تخیل اور فلسفیانہ یا نظری تفکر پر ہو۔ اسی طرح وہ ایسے شاعر پر بھی ہاتھ نہیں ڈالتے

جس کی فکر crystalize ہو چکی ہو، اور جو بات کو مکمل بنا کر اور فکری تیقن و تحکم کے ساتھ کہتا ہو۔ اُن کا یہ رویہ کچھ تو ذوقی محدودیت کی وجہ سے ہے اور کچھ فکری نظریاتی و اخلاقی جہات سے بے مناسبتی کی وجہ سے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ تعقلی + جمالیاتی تخیل، فلسفیانہ + اخلاقی تفکر، صداقتی + انقلابی جذبہ اور نشاطیہ + بلند و عمیق آہنگ پر مبنی شاعری، خواہ مبہم ہو یا غیر مبہم، نقاد یا شارح کو محض روایتی ذوق، ذہانت اور کسی بنے بنائے فکری نظام کے بل پر اپنے اوپر حاوی آنے اور مسلط ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس طرح کی شاعری کا معمولی نمونہ بھی ایک 'پورا پن' رکھتا ہے جو کسی متوازی بیان میں ڈھلنے والی لچک اور گنجائش نہیں رکھتا اور اگر معاملہ غالب و اقبال سے آ پڑے تو نقاد کی موت یقینی ہے۔ یہ دونوں، نقاد کو موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ خود کو نمایاں کر سکے، کوئی بات اپنے نام سے کہہ سکے۔ ان کی شاعری اپنی طرف بڑھنے والے کو سالم نگل جاتی ہے ورنہ ٹکڑوں میں اگل دیتی ہے۔ میر کی بات دوسری ہے۔ اُن کی ہمہ جہت بے کرانی میں آپ جتنا چاہے اُچھلتے کودتے پھریں، وہ پوچھیں گے بھی نہیں۔ اُن کا علاقہ ہی اتنا بڑا ہے کہ جہاں چاہیں ڈیرا لگالیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ان خطرات کا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ عسکری صاحب کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگی کہ گہرے فلسفیانہ مزاج اور جمالیات کے معروضی و موضوعی معیارات اور ان کے اصولِ تشکیل سے پوری واقفیت رکھے بغیر غالب اور اقبال کے دروازے پر دستک نہیں دی جاسکتی۔ لہٰذا انہوں نے ادھر کا رُخ ہی نہیں کیا۔ ظاہر ہے آدمی کو اپنی عزّت پیاری ہوتی ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ غالب کی عظمت اور انفرادیت کا clinical تجزیہ کرنے میں اب تک ایک ہی شخص کامیاب ہوا ہے: اقبال۔ دیکھیے اُن کی نظم، ''مرزا غالب''......

خندہ زن ہے غنچہ دلّی گلِ شیراز پر
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

یہ تو تھے وہ داخلی موانع جنہوں نے عسکری کو غالب و اقبال تک پہنچنے سے محروم رکھا: محدود ذوق اور مفقود فکر۔ ایک روک اور ہے جو بظاہر بنیادی لگتی ہے: روایت پرستی۔

سیدھی بات یہ ہے کہ ادبی نقطۂ نظر سے وہ تصورِ روایت بے معنی ہے جو چرکین کو تو قبول کرلے مگر غالب و اقبال کو نہیں۔ اس معاملے میں ابن عربی اور شنکر اچاریہ بھی آ جائیں تو ان سُن کر

ایے جائیں، عسکری صاحب تو بچارے کسی گنتی میں نہیں۔
مزید تفصیل شمس الرحمٰن فاروقی کی گفتگو میں آ گئی ہے۔ وہیں دیکھ لی جائے۔

O

۵۔ ''میر کی محسوساتی شاعری اگرچہ اُن کے محسوساتی سانچے میں fit بیٹھتی ہے لیکن وہ میر کی تفہیم کے بھی تمام تقاضے پورے نہیں کرتے۔''

اقتباس غلط ہے مگر بنیادی بات ٹھیک نقل ہوئی ہے۔ حوالہ دینا تھا تو اس فقرے کا دیتے:
''عسکری صاحب میر کے شعر کے لیے درکار ذوق کے تقاضے پورے کرتے ہیں، لیکن میر کے شعر کی تفہیم کے تمام تقاضے پورے نہیں کرتے۔'' میں نے یہ بات آپ کی بات پر کی تھی۔ مبین مرزا صاحب، لگتا ہے، ہماری گفتگو پڑھتے وقت اونگھ رہے تھے۔ ورنہ اُن کی نظر سے آپ کی گفتگو کا وہ حصہ اوجھل نہ رہتا جس کی بنیاد پر یا جس کی تائید میں مجھے یہ جملہ سوجھا۔ آپ نے یہ مسئلہ اُٹھایا تھا کہ:

''......لیکن میر کی شاعری میں جو زبان کا تخلیقی استعمال یا جس کو آپ کرافٹ کے، جو فنی رموز ہیں، عسکری صاحب کے ہاں اُن سے کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ وہ جو ایک پورا dimension ہے، وہ ان کے ہاں explore نہیں ہوتا۔ وہ ایک دروازے تک لاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس دروازے کے اندر کیا ہے، یہ بات ہمیں ان کی تنقید میں نظر نہیں آتی......''

اس بات کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہا جائے کہ نہیں آصف صاحب! آپ غلط سمجھے۔ عسکری صاحب نے تو میر کے فنی رموز اور کمالِ صناعی کو بالکل کھول کر رکھ دیا ہے، یا پھر مان لیا جائے کہ ٹھیک ہے جناب، عسکری صاحب کے یہاں واقعی یہ کمی پائی جاتی ہے...... ہاں ایک تیسرا جواب بھی ممکن ہے جو مخدومی جمال پانی پتی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ محمد حسن عسکری کی سطح کے نقاد کا کام ''صرف و محض ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کی تحسین تک محدود'' نہیں ہوتا۔

میری نظر میں چوں کہ آپ کی بات بالکل درست تھی لہٰذا میں نے اپنے لیے دوسرا جواب پسند کیا، اور آپ کا شارح یا ترجمان بن کر قدرے تفصیل سے کچھ باتیں کیں۔ مثلاً: ''(عسکری صاحب) میر کے شعر کی تفہیم کے تمام تقاضے پورے نہیں کرتے''، ''تفہیم میں یہ بات آتی ہے کہ اس کی جو صناعی ہے، اس کو کھولا جائے''، ''عسکری صاحب کا جو ذوق ہے، وہ معنی کے اوصاف سے

زیادہ متعلق ہے اور لفظ کے اوصاف سے کم“......

بالکل واضح بات ہے۔ جو نقاد میر ایسے صناعِ اعظم کے فنی اور جمالیاتی کمالات کو ہاتھ نہ لگائے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا رہے، اُس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ میر کی تفہیم میں ناقص ہے۔

مبین صاحب کو اس دعوے کے غلط ہونے پر اصرار ہے تو کھل کر بتائیں کہ اس میں غلطی کیا ہے۔ پٹے والے بچے کی طرح رو رو کر بڑھکیں مارنے سے کیا ہوتا ہے۔ خیر غلطی تو بچارے کیا بتائیں گے، اپنی ہی غلط فہمی دور کرلیں تو بڑی بات ہے۔

O

۶۔ ”وہ تخلیقی تجربے کو نہیں سمجھتے، اُس کی ماہیت کو بھی نہیں کھولتے، محض اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔“

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ عسکری صاحب یا تو تخلیقی تجربے کو سمجھتے نہیں ہیں یا اُسے بیان نہیں کرتے۔ مبین مرزا صاحب نے اس یا/یا کو حذف کر کے جتا دیا ہے کہ وہ مجھے عسکری دشمنی کے الزام سے برات کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتے۔

بہ ہرحال یہ اعتراض سے زیادہ بے اطمینانی کا اظہار تھا...... اس کا جواز جاننے کے لیے ذیل کے معروضات پر غور فرمائیں۔ (یہ درخواست آپ سے ہے، مبین مرزا صاحب اور مکرّمی صابر وسیم سے نہیں)۔

ہر فن پارے کی ایک خارجی ساخت یا ہیئت ہوتی ہے اور ایک داخلی۔ دونوں کا اصولِ تشکیل ایک ہی ہے جس میں اُس فن کا روایتی عموم بھی مندرج ہوتا ہے اور انفرادی اختصاص بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ عموم کا تعلق صرف خارج سے ہو اور اختصاص کا محض داخل سے۔ روایت و انفرادیت کا یہ باہم دگر تکمیلی عمل دونوں دائروں میں اُن کے ہم اصل امتیاز کو قائم اور ثابت رکھتے ہوئے جاری ہوتا ہے۔

روایت کے اعتبار سے یہ عمل، تخلیقی منہاج ہے اور انفرادیت کے لحاظ سے تجربہ۔ Perception اور expression، جیسا کہ اُس گفتگو میں سے ممتاز، ادراک، یعنی ذہن اور حس کا مشترکہ حاصل، اور اظہار یعنی فکر اور محسوسات کی وحدانی نمود میں ایک جوہر ہوتا ہے از خود رفتگی کا۔ یہ خود ورائیت (self-transcendence) ایک تخلیقی وفور سے بروئے عمل آتی ہے جو اُن معروف

تحدیدات کو توڑ دیتا ہے جو ادراک و اظہار کو ناقص رکھتے ہوئے انہیں اس طرح عینِ یک دیگر نہیں ہونے دیتیں کہ دونوں مکمل ہو کر ایک ہو جائیں۔ ظاہر ہے کمال کا نتیجہ وحدت ہی ہوتا ہے۔ مکمل ادراک اور مکمل اظہار ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

ادراک و اظہار کا مادّہ ایک ہے مگر لفظ اور ذہن، اور اشیا اور شعور کی mechanical اور جبری نسبت ان کے بیچ میں دیوار بن گئی ہے۔ تخلیقی وفور کا ریلا اُس دیوار کو گرا دیتا ہے۔

اس ریلے کا منبع کہاں ہے؟ اس سوال کا سامنا کرنے کی اہلیت ہو تو بڑی تنقید پیدا ہوتی ہے۔ تخلیقی منہاج اور تجربے کی ماہیت تک پہنچنے کی جدوجہد، چاہے جس رنگ میں ہو، سچے نقاد کی ذمہ داری ہے۔ وہ اس فریضے سے عہدہ برآ ہو گا تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچے گی کہ ادب بھی حقیقت اور صداقت کا مظہر اور ترجمان ہے...... وہ حقیقت اور وہ صداقت جسے شعور، زبان اور اشیا کے دستیاب روزنوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

در دو چشم من نشیں اے آنکہ از من، من تری

محمد حسن عسکری تخلیقی عمل اور تجربے کے بعض اوضاع تک رسائی تو رکھتے ہیں مگر ان کی گہرائی میں اُترنے کی ناکام کوشش بھی نہیں کرتے۔ کیوں کہ اس کام کے لیے محض ایک مخصوص ادبی ذوق، اور معلومات میں ایک اُفقی ربط اور بالکل لپٹی ہوئی ترکیب و ترتیب پیدا کر کے اُنہیں نہایت رواں اسلوب میں بیاں کر دینے کی صلاحیت کافی نہیں۔ یہاں غیر معمولی تفکّر درکار ہے۔ عارفانہ + فلسفیانہ + شاعرانہ تفکّر جو غالب و اقبال کی خصوصیت ہے۔

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا

ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

یہ مبین مرزا صاحب سو تو نہیں گئے!

O

۷۔ ''وہ غالب پر، اقبال پر کلام نہیں کرتے، اُردو کے پانچ چھ بڑے شاعروں کی بابت ہمیں کچھ نہیں بتاتے۔''

اس کا جواب اوپر ہو چکا ہے۔ اپنے مضمون میں ایک جگہ مبین صاحب نے ثابت کیا ہے کہ عسکری صاحب نے غالب و اقبال پر خاصا کلام کیا ہے۔ اس کی حقیقت وہاں پہنچ کر دیکھ لیں گے۔

O

وہ خود اپنے ہی تعصبات کی روشنی میں بناتے ہیں، اور

۸۔ ''ادب میں ردّ وقبول کے پیمانے وہ خود اپنے ہی تعصبات کی روشنی میں بناتے ہیں، اور اپنے تعصبات کا شدت سے اسیر ہونے کے باعث بدذوقیاں پھیلاتے ہیں۔''

تنقید بڑی حد تک تعصبات ہی پر کھڑی ہوتی ہے، اس لیے عسکری صاحب پر تعصبات کی شدت وغیرہ کا چارج لگانا میری بے وقوفی تھی۔ ہاں بدذوقیاں انہوں نے پھیلائی ہیں، مثلاً فراق کے بارے میں اُن کا پورا رویّہ اور تمام دعوے بدذوقی بلکہ بدترین بدذوقی کے بہترین نمونے ہیں۔ 'روایت' کے ادبی اور تخلیقی اظہار کے مبحث میں اُن کا بیش تر کام کسی خوش ذوقی پر دلالت نہیں کرتا۔ غالب سے اُن کی وحشت بھی ایک خاص نوع کا جوار رکھنے کے باوجود ادبی وشعری ذوق کے محکم ترین مسلمات سے متصادم ہے۔ ایک جگہ میر کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دے کر ایلیٹ اور Yeats سے بھی چھوٹا بتایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نظریۂ ادب کا خالق بنا دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک قولِ گرامی کی ایسی تشریح کی ہے جو اور تو اور غایتِ رسالت کو باطل کر دیتی ہے۔ نعوذ باللہ۔ اسی طرح حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی بُت شکنی پر بھی ادبی تجربے وغیرہ کے اصول پر کلام کرنے کی جسارت کی ہے۔ ابن عربی کی مدح میں انہوں نے ایسے ایسے فقرے لکھے ہیں جو دینی ذوق کے فقدان پر تو شاہد ہیں ہی، فکری اور ادبی بد ذوقی پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر: ''ابن عربی حق الیقین کے درجے کو پہنچ چکے ہیں''، ''اُن کا علم بھی ایک الگ نوعیت رکھتا ہے...... اس علم میں تو جاننے والا اور جو چیز اُس نے جانی، دونوں ایک ہوجاتے ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔

غرض کیا لوں اور کیا چھوڑوں۔ ایک ''بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے۔'' میں ایسے ایسے تماشے دکھائے ہیں جن کے لیے آدمی کا بے خبر ہونا ہی کافی نہیں، بے ذوق ہونا بھی ضروری ہے۔

O

۹۔ ''اُن کی تشخیص درست مگر تجویز مضحکہ خیز ہے۔ وہ بیل تو پورا بناتے ہیں لیکن دُم شیر کی لگا دیتے ہیں۔''

''مشرق اور مغرب کی آویزش'' اور میر و غالب کی جدیدیت والے مسئلے پر گفتگو کا خاتمہ میں نے ان الفاظ پر کیا تھا۔ یہ کہنے کی نوبت ایک پوری تقریر کرنے کے بعد آئی ہے۔ میرے خیال میں وہی کافی ہے۔ جس کو دلچسپی ہو ''شب خون'' میں دیکھ لے۔

ہاں اگر یہ فقرہ میری بدتمیزی اور گستاخی کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے تو علیٰ راسی وعینی۔ خط

ختم کرنے سے پہلے تمام بدتمیزیوں اور گستاخیوں کی اکٹھی معافی مانگ لوں گا۔ انشاء اللہ۔

O

۱۰۔ ''وہ اپنے ادبی کیریئر کے دوران وقتاً فوقتاً مختلف دکانوں سے نفسیات، تہذیب اور میناژس کے تھیلے خریدتے رہے، اور تھیلوں کے اسی انتخاب کی وجہ سے رُسوا ہوئے۔''

بھائی، اُن دکانوں کا نام پتا آپ بتا دیں یا قیصر عالم۔ مجھے تو مبین مرزا صاحب سے بس اتنا پوچھنے دیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط؟

O

ہمارے ''اعتراضات وتحفظات'' کی پوری فہرست یا فردِ جرم بنانے سے فارغ ہوکر اب مرزا صاحب پورے وقار اور اعتماد کے ساتھ میدان میں اُترتے ہیں۔ جس دھج سے کوئی مقتل کو چلا وہ شان سلامت رہتی ہے۔

ہم نے اپنی گفتگو میں کئی جگہ اس بات کو دُہرایا تھا کہ محمد حسن عسکری جیسے بھی ہیں، اُردو کے عظیم ترین اور ایک معنی میں واحد نقاد ہیں۔ صابر وسیم صاحب کی طرح مبین مرزا صاحب بھی اسے ہماری کوئی چال سمجھے۔ فرماتے ہیں:

''اگر اُردو کا سب سے بڑا اور واحد نقاد فی الحقیقت ایسا ہے تو یہ اُردو زبان و ادب اور اس کے ساتھ ساتھ سب اہل اُردو کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔''

آصف صاحب، آپ کا تو میں کہہ نہیں سکتا، مگر مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔

O

عسکری صاحب سے فکر کی نفی کر کے اُنہیں محسوسات کا آدمی ثابت کرنے کے لیے اس ناچیز نے ذوق وفہم کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، اُن پر مبین مرزا نے تین اعتراضات وارد کیے ہیں:

۱۔ حد درجہ مجرد اور مبہم ہیں۔

۲۔ ''عسکری صاحب کی تحریروں سے متعلقہ حوالوں کی عدم موجودگی میں نہ تو اپنا کوئی جواز پیدا کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی کوئی relevance قائم کر پاتے ہیں۔''

۳۔ یہ پوری گفتگو تناقضات کا شکار ہے۔

پہلے دو اعتراضات مبین مرزا صاحب کی تحریر میں ایک ہی اعتراض کے دو جُز ہیں۔ میں نے

اپنی سہولت کے لیے ایک کے دو بنا دیے۔

کسی فی البدیہ گفتگو میں جو ایک ہی نشست میں تمام ہوئی ہو اور جس کے مخاطب بھی صبا وسیم، مبین مرزا اور چوہدری ابن النصیر ایسے حضرات نہ ہوں، حوالے بازی کا اہتمام نہیں ہوتا۔ ابتدا ہی میں مطالعہ عسکری کے تین تناظر قائم کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ہر ہر بات پر تحریری شواہد پیش کرنے کی حاجت نہ رہے۔ کیا یہ بات واضح نہیں ہے کہ ''جھلکیاں'' تک عسکری صاحب کا قریب قریب سارا کام ہامعنی تاثرات کا اظہار ہے؟ یہ ذوق کی معنویت کا انکشاف نہیں ہے؟ اسی طرح ''انسان اور آدمی'' کے بعض اور ''ستارہ یا بادبان'' کے بیش تر مضامین میں تاثر کو تصور بنانے کی کوشش نظر نہیں آتی؟ کیا یہ ذوق ہی کی اندرونی تکمیل و توسیع کا عمل نہیں ہے، جس سے ذوق میں ایک 'ذہنیت' بھی پیدا ہو جاتی ہے؟ اور پھر اپنے آخری دور میں عسکری صاحب مختلف تہذیبی اور تخلیقی مظاہر کو جوڑ کر روایت کے ایک مابعد الطبیعیاتی تصور میں سمونے کی جو کاوش کرتے رہے، وہ ان کی احاطہ خوئی کا مظہر ہے کہ نہیں؟

میں کالی داس گپتا رضا بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر ادوار کی یہ تقسیم تحقیقی اور تاریخی معیار پر پوری نہیں اترتی تو نہ اترے۔ میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں، اگر محمد حسن عسکری کا پورا کام ان تین رویوں میں بنا ہوا نہیں ہے تو میرا مقدمہ یقیناً رد ہو جاتا ہے۔

مبین مرزا صاحب نے اچھا کیا کہ اس فضول بحث میں نہیں پڑے۔ ادوار کی اس تقسیم کو chaotic کہنے پر کفایت کرتے ہوئے سیدھے کام کی بات پر آ گئے۔

عسکری صاحب کے پہلے دور کو میں نے معنویت ذوق کھولنے کا دور قرار دیا تھا۔ اس پر ایک گماگ منطقی کی طرف گرفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہم شرکاء گفتگو سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ ذوق کی معنویت کھولنے سے ان کی مراد کیا ہے؟ اس لیے کہ ان کے بقول ذوق تو پوری کی پوری ایک ایسی حس ہے جو عقل کو اپنی متابعت میں رکھتی ہے۔ اس تعریف کی رو سے تو ذوق کی معنویت کھولنے کا مطلب ہے حس کی معنویت کھولنا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حس کی معنویت کھولنے سے کیا مراد ہے؟ لیکن اس پوری گفتگو میں ہمیں کہیں اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ہمیں بس یہ بتایا جاتا ہے کہ ذوق کی معنویت کھولنے اور اس کا تجزیہ کرنے کا حیرت انگیز ملکہ عسکری صاحب میں شروع ہی سے پایا جاتا ہے۔ اب یوں تو تجزیہ کرنے کے لیے آدمی کے پاس تجزیہ کار عقل یا فکر و فہم کا ہونا ضروری ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ

یہ چیز عسکری صاحب کے پاس ہے۔ وجہ؟ صاف بات ہے اگر ہم یہ کہیں گے کہ عسکری صاحب فکر و فہم رکھتے ہیں تو شرکائے گفتگو کا تھیسس رد ہو جائے گا۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ عسکری صاحب فکر کے نہیں، محسوسات کے آدمی ہیں۔ سو طوعاً و کرہاً ہی سہی، ہم مانے لیتے ہیں کہ کم از کم پہلے دور میں عسکری صاحب کے یہاں فکر و فہم کا وجود نہیں تھا —— اس دور میں لے دے کر اگر کوئی چیز اُن کے پاس تھی تو وہ فقط ذوق ہی ذوق تھا۔ چناں چہ لازم آیا کہ وہ ذوق کا تجزیہ بھی ذوق ہی کے ذریعے کرتے ہوں گے۔ یہاں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس باریک اور دقیق نکتے کی دریافت کا کریڈٹ ان صاحبان علم و فضل سے پہلے بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا تھا——''

واہ کیا توپ چلائی ہے۔ ہمارے استدلال کو 'تسلسل' پر مبنی دکھانے کا یہ کارنامہ انھی طوسی و تفتازانی سے صادر ہو سکتا تھا۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ برخوردار، آپ کی یہ تقریر بس ایک چیز پر دلالت کرتی ہے، اور وہ ہے جہل مرکب۔ اس کا مطلب ظاہر ہے وہ کاہے کو سمجھیں گے۔ کہیں مل جائیں تو آپ ہی بتا دیجیے گا۔

موصوف نے اپنی سمجھ کے عین مطابق یہ ٹھان رکھی ہے کہ محسوسات کا آدمی عقل و شعور اور فہم و ادراک سے لازماً بے بہرہ ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھلے آدمیوں کو کیسے باور کروایا جائے کہ فکر کی نفی کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا اور محسوسات میں فہم و ادراک بلکہ ذہن کی اعلیٰ درجے کی فعلیت اسی طرح موجود ہوتی ہے جیسے پانی میں تری اور آگ میں حرارت۔ انہوں نے اس گفتگو کا مطالعہ ویسے اگر پڑھنے کی طرح پڑھا ہوتا تو ایسے مہمل اعتراض کی نوبت نہ آتی۔ تعجب ہے کہ ایسے واضح جملے بھی ان کی ناسمجھی کا کچھ نہ بگاڑ سکے:

''اگر محسوس، mind پر غالب آ جائے تو اس سے ذوق پیدا ہوتا ہے، اگر mind، محسوس پر غالب آ جائے تو کوئی چیز دوسرے حال پر باقی نہیں رہتی۔'' (یعنی ہر چیز، اپنے ایک ہی حال پر fix ہو جائے)۔

''بڑے تخلیقی نمونوں سے میری وابستگی کا آغاز اور بنیاد ذوق میں ہے۔''

''عسکری صاحب کا جو ذوق ہے وہ معنی کے اوصاف سے زیادہ متعلق ہے۔''

''احساس کہتے ہیں...... ذہن کے تمام contents کو experience کر کے انہیں زیادہ حقیقی بنا دینا۔''

''میرا اپنے احساس سے جس معنویت کو حقیقی بنا دیتا ہے، عقل اپنی تمام کاوش سے وہاں تک

نہیں پہنچ سکتی۔"

"احساس ایک پل ہے میری عقل اور میرے نفس کے درمیان۔"

جس شخص کو اخروٹ توڑنے کا تجربہ نہ ہو، وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس کے لیے ہتھوڑی ڈھونڈے، بٹا تلاش کرے یا فرش پر زور سے پٹخ کر دیکھے۔ اس وقت میری یہی حالت ہے۔ کچھ نہیں سوجھ رہا کہ ان صاحب کا کیا کیا جائے، ان کے سوالوں سے کیوں کر نمٹا جائے۔ وہ ہاتھی کا پوچھیں اور میں فیل کہہ دوں تو پھر شور مچ جائے گا کہ لیجیے، پوچھا کیا تھا اور جواب کیا آیا۔ کسی دانش ور نے ایک صاحب سے پوچھا کہ مکھی اور گینڈے میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی ایک علامہ تھے، بولے کہ گینڈا اڑ نہیں سکتا۔ دانش ور نے کہا: "بالکل غلط۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ گینڈا میری ناک پر نہیں بیٹھ سکتا۔" مجھے ڈر ہے کہ اس سوال جواب سے فارغ ہو کر یہی نہ سننا پڑے کہ بالکل غلط، گینڈا...... الخ۔

دبستانِ عسکری کے یہ فرفریوس "رک کر" دریافت فرماتے ہیں کہ (ادب میں) ذوق کی معنویت کھولنے سے کیا مراد ہے؟ ہم رُکے بغیر عرض کرتے ہیں کہ جمالیاتی شعور کی غایت یعنی حصولِ مسّرت کے عمل میں محسوسات کے بنیادی اور مرکزی کردار کا ایسا تجزیہ جو متن اور قاری دونوں پر منطبق ہو سکے۔ اُنہیں سمجھانے کے لیے بات کو سکیڑ کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب نقاد یہ دکھانے چلتا ہے کہ تاثر بھی عام مفہوم کی طرح بامعنی ہوتا ہے تو وہ یہی ذوق کی معنویت کھولنے جا رہا ہوتا ہے۔

مبین مرزا صاحب کا اگلا سوال واقعی تباہ کن ہے: "حس کی معنویت کھولنے سے کیا مراد ہے؟"...... اس سوال نے میری تو سٹّی گم کر دی تھی مگر اللہ کا شکر ہے کہ صحیح جواب سوجھ گیا۔ حس کی معنویت کھولنے سے مُراد ہے گینڈے کو مرزا صاحب کی بینی مبارک پر بٹھا کر صابر وسیم صاحب کو دعوت دینا کہ حضت! دیکھ لیں، پھسلتا نہیں ہے......

چلیں، سوال جواب تو ختم ہوئے۔ اب آصف صاحب، مجھے آپ سے یہ پُوچھنا ہے کہ کیا واقعی ادب سے تعلق کا دعویٰ رکھنے والا کوئی شخص اتنا کند ذہن اور بدمذاق ہو سکتا ہے کہ اُسے یہ بھی پتا نہ ہو کہ معنی، تصوّر و تصدیق کی جس ترکیب سے عبارت ہے، اُسی سے ظاہر ہے کہ متن سے قاری تک اس کی منتقلی کا عمل دو immediate ends رکھتا ہے: فہم اور تاثر۔ دوسرے لفظوں میں، معنی محض مفہوم یا تاثر نہیں ہے بلکہ تصوّر یا تصدیق بھی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک وصف بھی اس سے

منہا نہیں ہوسکتا۔ مفہومیت اور تاثریت، معنی کے وہ لازمی اجزا ہیں جو غالب و مغلوب کی حیثیت تو اختیار کر سکتے ہیں لیکن موجود و معدوم کی نسبت قبول نہیں کر سکتے۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ ایک غالب ہو اور دوسرا مغلوب، مگر یہ محال ہے کہ ایک موجود ہو اور دوسرا غائب۔

محسوسات کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ ادراک کا وہ pattern جو ذہنی نہیں، وجودی ہے۔ جو اگر ناقص رہ جائے تو تاثر، مفہوم پر غالب آجاتا ہے، اور کامل ہو تو تصدیق، تصوّر پر۔ اسی pattern کو میں نے اپنی گفتگو میں انفعال کہا تھا، اور اسی جہت سے اس کے فی الاصل انسانی ہونے کا انکار کیا تھا۔ مبین مرزا صاحب چوں کہ اُس 'روایت' کی بھی شدبد نہیں رکھتے جس سے عسکری صاحب اسم اعظم کا کام لیتے ہیں، لہٰذا انہوں نے اس انفعال کو انفعالیت بنا ڈالا۔ اگر 'روایت' کی ابتدائی چیزیں بھی پڑھی ہوتیں تو ایسی مضحکہ خیز غلطی نہ کرتے۔

ایسی صورتِ حال میں آپ ہی بتائیں کہ مبین مرزا صاحب اور صابر وسیم صاحب کے آگے کون سی بین بجائی جائے کہ ان کی سمجھ میں آجائے کہ کامل محسوس، کامل معقول پر تخلیقی لحاظ ہی سے نہیں بلکہ تحقیقی اعتبار سے بھی اوّلیت اور فوقیت رکھتا ہے۔ (دونوں دوستوں کی سہولت کے لیے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں تحقیق کا مطلب ہے: معرفتِ حقائق) اور یہ تفوق درجۂ کمال ہی میں نہیں بلکہ عسکری صاحب کی سطح پر بھی برقرار رہتا ہے جہاں محسوسات کمال کو نہ پہنچنے کے باوجود فہم و تاثر کے اتحاد کی سمائی رکھتے ہیں۔ ان میں یہ گنجائش بہ ہرحال پائی جاتی ہے کہ مفہوم، تاثر میں ڈھل سکے اور تاثر، مفہوم میں۔

محمد حسن عسکری کو محسوسات کا آدمی کہہ کر انہیں خدانکردہ وہ صابر وسیم تھوڑا ہی بنایا ہے۔ میری رائے میں جب تک انہیں اپنے مردِ محسوسات ہونے کا پاس رہا، ادبی نقاد کے طور پر مراحلِ کمال طے کرتے رہے۔ لیکن جوں ہی رینے گینوں کے طلسم میں پھنسے، سیڑھیاں اُترنے کا عمل شروع ہوگیا۔ ہر صحرا سے مٹھی بھر ریت لے کر اپنا گھروندا بنانے کی ٹیکنیک یہاں کام نہیں آسکتی تھی۔ ایک آدھ مضمون کی حد تک تو کچھ دال دلیا ہوگیا لیکن آگے جانے کے لیے جو چیزیں درکار تھیں وہ عسکری کے پاس کہاں۔ مثلاً رینے گینوں کے symbolism کو صرف ہاتھ لگانے کے لیے بھی اعلیٰ درجے کا منطقی، ریاضیاتی اور فلسفیانہ ذہن مطلوب ہے۔ محض ادبی پرداخت رکھنے والا شخص وہاں نہیں چل سکتا ورنہ بس آموں کا بیان کرتا رہ جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ضروری ہے...... دینی ذوق اور فہم سے محرومی۔ یہ ضرورت عسکری صاحب کسی حد تک پوری کرتے ہیں۔

تو جناب آپ ہی کوئی ترکیب کیجیے کہ ان حضرات کی سمجھ میں آ جائے کہ ذوق کا تجزیہ وہی عقل کرتی ہے جس نے ذوق کی متابعت قبول کر رکھی ہے۔ عقل ہم عشق است و از ذوق جنوں بیگانہ نیست۔

O

''میر مجلس کے بقول'' عسکری صاحب کے دوسرے دور میں ذوق وفہم کی یک جائی، ذوق کی شرائط کی بنیاد پر ہوئی، ''یعنی اس یک جائی میں ذوق کو فہم پر سبقت حاصل رہی۔ مُراد یہ کہ ذوق اور فہم پوری طرح یکجان نہ ہو سکے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کے بقول ''محسوسات کا آدمی وہ ہوتا ہے جو ذوق کو فہم پر ترجیح دے'' (یعنی دونوں کو یکجان نہ کر سکے)۔ اب اسے میر مجلس کے حافظے کی کمزوری پر محمول کیا جائے یا ان کے موقف کا تناقض اور تضاد کہا جائے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ محسوسات کے آدمی کی تعریف اور حدود بھول کر عسکری صاحب کے یہاں ذوق وفہم کے یکجان ہونے کا مژدہ سُناتے ہیں ......

اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں۔ میر مجلس کی مقرّر کردہ تعریف کی رو سے محسوسات کا وہ آدمی از خود تحلیل ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ فکر وفہم کا حامل ایک ایسا شخص نمودار ہوتا ہے۔ جو اپنی فکر اور بصیرت کے بل بوتے پر ذوق اور فہم کو یکجان کیے ہوئے ہے۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ عسکری صاحب کی فکر کی نفی کرتے کرتے میر مجلس کو بالآخر ان کی فکر کے اثبات پر آ کر قیام کرنا ہی پڑا۔''

ان بھولے بادشاہوں سے دست بستہ عرض ہے کہ حضور، دو چیزوں کی یکجائی یا یکجانی ممکن ہی نہیں اگر ایک کو غلبہ، سبقت اور ترجیح حاصل نہ ہو۔ ذوق وفہم دو اوصاف ہیں، جن کی یکجانی میں بنیادی حیثیت اُس وصف کی ہوگی جو صاحبِ اوصاف کی ذاتی بناوٹ سے زیادہ قریب ہوگا۔ محسوسات کے آدمی میں چوں کہ ذوق بنیادی وصف ہے لہٰذا فہم کے ساتھ اس کے اتحاد کا عمل اسی کی اساس اور شرط پر صورت پکڑے گا۔ مہربانی فرمائیں اور دماغ عالی کو ان باتوں میں نہ اُلجھائیں جن کے لیے یہ بنایا ہی نہیں گیا۔

اور یہ فہم کا نام آتے ہی مرزا صاحب کو فکر کا دورہ کیوں پڑ جاتا ہے۔ اس خبط کو کیا کہتے ہیں؟ میں نے گفتگو میں کہیں کہہ دیا تھا کہ عسکری صاحب کا ذوق، لفظ کے اوصاف سے کم اور معنی

کے اوصاف سے زیادہ تعلق رکھتا تھا۔ اپنے پہلوان جی نے اس کا بھی دھوبی پڑا کر دیا۔

''اب چوں کہ معنی کے اوصاف کا تعلق بھی سمجھنے اور سمجھانے ہی سے ہے،
اس لیے یہاں آ کر بھی عسکری صاحب کا ذوق اور فہم ایک ہوگئے، اور ایک ہو کر
بلاتامل عسکری صاحب کو فکر و فہم کا آدمی ثابت کرنے لگے نہ کہ محسوسات کا۔''

آصف صاحب، یہ حقیر پر تقصیر مبین مرزا صاحب سے رُو در رُو ہو کر بس اتنا معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میاں کس احمق نے آپ کو یہ پٹی پڑھادی ہے کہ معنی کے اوصاف کا تعلق فکر و فہم سے ہوتا ہے۔ اوصافِ معنی کا تصوّر ہی ذوقی ہے۔ باقی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

O

اگلے پیرے میں بھی ناسمجھی کا مظاہرہ اسی طرح جاری ہے۔ دو باتوں کو طول دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جاوید نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ عسکری صاحب ''کسی ادب پارے یا تخلیقی تجربے کو محسوس تو کرتے ہیں، سمجھتے نہیں......'' اور دوسری یہ ہے کہ میر کی تفہیم کے تقاضے پورے نہ کرنے کا الزام لگانے کے بعد، دروغ گورا حافظہ نباشد کے مصداق، اس لپاڑیے نے ذرا آگے جا کر کھلے لفظوں میں یہ اعتراف بھی کرلیا کہ ''عسکری صاحب نے میر کو ذوق کی سطح پر بھی سمجھا دیا اور فہم کی سطح پر بھی......'' اب بتائیے یہ واضح تناقض ہے کہ نہیں؟

بالکل ہے جناب، بشرطیکہ معیار مرزا صاحب کے فہم کو بنایا جائے۔ موصوفِ محترم سے بے تکلفی نہیں ہے ورنہ اتنا تو ضرور کہتا اور ذرا چلا کر، کہ یہ کیا فکر فکر اور فہم فہم کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کچھ پتا بھی ہے یہ کن چڑیوں کے نام ہیں۔ میں نے یہ کہا بکا ہے کہ عسکری صاحب کسی ادب پارے کو محسوس تو کرتے ہیں، سمجھتے نہیں ہیں؟ مرزا صاحب میری گفتگو میں تناقض کا ثبوت اس طرح کے حوالوں سے دیں گے تو پھر بات ہو چکی۔

بھائی کو معلوم ہی نہیں کہ شعر کا فہم بڑی بلکہ بہت بڑی حد تک ذوق پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ سوچنا جنون ہے کہ ایک شخص ذوق تو رکھتا ہے مگر فہم سے عاری ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے جب مجھے یہ وسوسہ بھی گزرے کہ محمد حسن عسکری شعر کا فہم نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے جس شاعر پر بھی ذرا جم کر لکھا ہے، اُس کی تفہیم کا کوئی نہ کوئی نیا در ضرور کھولا ہے۔

چلیے مبین مرزا صاحب کی خیر خواہی کرتے ہوئے یہ بتا دیا جائے کہ 'فکر و فہم' کی ترکیب ایسی ہے جیسی کہ 'کوہ وکاہ'، 'شاہ وگدا' وغیرہ۔ فہم، شے کا محکوم ہے جب کہ فکر، حاکم۔ ایک کی اصل انفعال

ہے اور دوسرے کی فعل۔ آئندہ دونوں کو ایک کرنے اور بھنے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ کسی پڑھے لکھے آدمی سے ایسی حرکت کا ارتکاب ناممکن ہے۔

O

ایک انکشاف یہ کیا گیا ہے کہ ہم لوگوں نے عسکری صاحب کو 'انفعالیت زدہ تاثر پرست' کہا ہے۔ ہمارے علامہ فہامہ نے یہ نتیجہ ان تین قضیوں سے نکالا ہے: (۱) عسکری صاحب محسوسات کے آدمی تھے، (۲) Object Oriented تھے اور (۳) چیزوں سے تعلق میں فاعلی جہت کی بجائے انفعالی جہت پر زور دیتے تھے۔

اگر کوڑھ مغزی لائق تعزیر ہوتی تو بخدا مبین مرزا صاحب یوں کھلے نہ پھر رہے ہوتے۔ ہمارے معاشرے میں جہالت اور سفاہت موجبِ رُسوائی نہیں رہی، ورنہ اس حرکت پر تو وہ کسی بلیک میلر کے ہتھے چڑھ سکتے تھے۔

غضب خدا کا! کہاں کی بات کہاں لے گئے۔ ارے یہ تینوں باتیں، لامتناہی فرق مراتب کے باوجود، خدائے سخن فردوسی تک پر صادق آتی ہیں، جس پر بڑے سے بڑے مفکّر کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ تاہم ابوالقاسم فردوسی اور محمد حسن عسکری میں کم از کم اتنا فرق تو ہے جتنا موجود اور معدوم میں ہوتا ہے۔ ایک کے لیے فکر کا آدمی نہ ہونا کوئی نقص نہیں ہے جب کہ دوسرے کے لیے ہے۔

برادر، میرا تو دماغ سُن ہوکر رہ گیا ہے۔ آنچہ می بینم بہ بیدار یست یارب یا بہ خواب۔ یقین نہیں آرہا کہ عسکری کے دفاع کے لیے اُٹھنے والا کوئی شخص اتنا بھی پیدل ہوسکتا ہے۔ سچ ہے دُنیا بھر کا علم مل کر بھی ایک بندے کی بے علمی کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ نادانی میں جو وسعت ہے وہ دانائی میں کہاں۔

اور ذرا شانِ خود اعتمادی تو دیکھیے کہ کس طرح گردن کو کلف دے کر ہمیں متنبہ کیا جارہا ہے کہ تم لوگ عسکری صاحب کو" انفعالی جہت پر زور دینے والا محسوسات کا آدمی کہہ کر ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو۔ تمھیں شاید یہ خیال نہیں رہا کہ ایسی بے بنیاد اور پادر ہوا باتوں سے رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔"

O

قیصر عالم نے عسکری صاحب کے ایک سنگین نقص کی نشان دہی کی تھی کہ اُن کے ہاں غالب و اقبال کی قبولیت نظر نہیں آتی۔ اُن کے مطلب یہ تھا کہ عسکری صاحب نے ذوق اور فہم کے

جو معیارات رائج کیے تھے، وہ غالب اور اقبال ایسے شعرا کی تحسین میں کام نہیں آسکتے۔ تحسین کجا، تحقیر کا سبب بن جاتے ہیں۔ میں نے اُن سے اتفاق کرتے ہوئے کچھ باتیں عرض کی تھیں۔ مبین مرزا صاحب ان پر گرفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''چہ خوب! اس قسم کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عسکری صاحب پر بزعم خویش اپنے بھاری بھرکم اعتراضات سے پہلے یا تو ان حضرات نے عسکری صاحب کا ٹھیک سے مطالعہ نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو اُنہیں سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ مستزاد اس پر یہ کہ وہ دوسروں کی بابت شاید گمان رکھتے ہیں کہ اب عسکری صاحب کو پڑھنے اور سمجھنے والے باقی ہی کہاں رہے، اس لیے اُن کے بارے میں جو بے پر کی چاہو اُڑا دو، کوئی ٹوکنے والا نہ ہوگا۔''

پہلے تو جناب، میں اپنی وہ بات واپس لیتا ہوں جو اس خط کے شروع میں لکھی ہے کہ مبین مرزا صاحب نے الزام تراشی سے گریز کیا ہے۔ نہیں، گریز نہیں کیا۔ ان باتوں کا شافی جواب تو وہی ہے جو قہقہے سے آغاز ہو کر آخ تھو پر ختم ہو جائے، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ مبین مرزا صاحب خود اپنی بچہ پارٹی میں بھی منھ دکھانے کے قابل نہ رہ جائیں۔ بس یہی گزارش کروں گا کہ ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است۔ لیکن نہیں، اُنہیں کیا ڈر! وہ جانتے ہیں کہ شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں۔ البتہ محمد حسن عسکری پر رحم فرمائیں۔ ایسی باتیں کر کے وہ اُن کے لیے خطرات پیدا کر رہے ہیں۔ عسکری صاحب کو scare crow بنا کر ایسی زمینوں پر نہ گاڑیں جہاں آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ اُڑ جائیں گے۔

آگے ہماری غلط فہمی یا غلط بیانی کا ازالہ فرمایا ہے:

''...... عسکری صاحب نے نہ صرف غالب اور اقبال پر کلام کیا ہے بلکہ انہیں appreciate بھی کیا ہے اور اس height پر جا کر کیا ہے کہ اقبال کو بیسویں صدی کا بڑا شاعر کہا ہے، اور غالب کے بارے میں لکھا ہے......''

واقعی ایسا قاطعِ برہان جملہ مبین مرزا صاحب لکھ سکتے ہیں یا محترم صابر وسیم۔ اقبال زندہ ہوتے تو اس کرم فرمائی پر یقیناً ممنون ہوتے کہ عسکری صاحب نے نہ صرف مجھ ناچیز پر کلام کیا ہے بلکہ مجھے appreciate بھی کیا ہے اور نجانے کس height پر جا کر اس تک بند کو بیسویں صدی کا بڑا شاعر بنایا ہے۔

خیر۔ اب دیکھیے کہ عسکری کے دو ڈھائی ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے تنقیدی کام میں سے غالب کے بارے میں کیا چیز چھانٹی گئی ہے:

"روحِ عصر نے ان کو اپنی ترجمانی کے لیے چھانٹا تھا، اور وہ اردو کے پہلے بڑے شاعر تھے۔ جنہیں روحِ عصر نے اس طرح چھانٹا ...... بڑا شاعر اتنی بڑی روح کا مالک ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری نسلِ انسانی کی مجموعی کیفیت کا احاطہ کرسکتا ہے۔ اگر غالب میں کوئی اور بات نہ ہوتی تو انہیں بڑا بنانے کے لیے یہی بات کیا کم تھی کہ انہوں نے اپنے زمانے اور اپنے بعد کے سو سال تک والے زمانے کے اہم ترین اور غالب ترین روحانی عناصر کو اپنے اندر محسوس کرلیا اور صرف یہی نہیں، بلکہ انہیں محسوس کرنے کے بعد ان کی شعری تشکیل بھی کی......"

بھائی، میں نے اصل سے مراجعت کرلی ہے، یہ عسکری صاحب ہی کے فرمودات ہیں، مبین مرزا صاحب کے نہیں۔ حیران ہونے کی بات نہیں، عسکری کے غالب شناسی کا یہی معیار ہے۔ یوں تو لفظ لفظ خندہ آور ہے لیکن "اتنی بڑی روح" اور "اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ......" کا تو جواب ہی نہیں ہوسکتا۔

مبین مرزا صاحب کی تحقیق انیق یہ ہے کہ غالب و اقبال پر عسکری صاحب کے یہاں کم از کم چھ سات مضامین تو مل ہی جاتے ہیں۔ چھ سات چھوڑ ایسے چھ سات سو مضامین بھی نکل آئیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔

مبین مرزا صاحب پھر سن لیں کہ ہمارا اعتراض یہ نہیں ہے کہ عسکری صاحب میر کو غالب پر ترجیح کیوں دیتے ہیں، یہ تو اُن کی خوش ذوقی ہے، ہم رونا یہ رو رہے ہیں کہ انہوں نے ہمارے اندر بڑی شاعری کے ذوق اور فہم کی جو سطح پیدا کی ہے، وہاں فراق ایسا ان گھڑ شاعر تو دندناتا پھر رہا ہے اور غالب و اقبال مفقود الخبر ہیں۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اُنہوں نے غالب و اقبال پر کتنا لکھا اور کتنا نہیں لکھا، مسئلہ یہ ہے کہ ان کا تصورِ شعر ان دونوں کو نظر انداز کر کے وضع ہوا ہے۔ ان کی انگلی تھام کر چلنے والا غالب اور اقبال کی زمین پر قدم رکھنے کے قابل نہیں رہتا اور یہ اتنی بڑی کم نصیبی اور محرومی ہے کہ اس سے نکلنے کے لیے عسکری کا ہاتھ بھی جھٹکنا پڑے تو ہچکچاہٹ حرام ہے۔ باقی مبین صاحب یہ بچگانہ رعب اندازی

کہیں اور دکھائیں کہ غالب کے سلسلے میں اُن کے مجموعی رویّے کے پیچھے ''آدمی اور انسان کے بارے میں عہد حاضر کے تصورات کا وہ فرق کارفرما ہے جسے سمجھے بغیر نہ تو ہم میر اور غالب کے فرق کو درست تناظر میں سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی عہد حاضر کو... '' کیا مہمل بات ہے۔ ''عہد حاضر کے تصورات کا فرق'' ''میر اور غالب کے فرق کا درست تناظر'' کیسے بن گیا! اور یہ ''درست تناظر'' محمد حسن عسکری سے منسوب کر کے ان صاحب نے اپنی عسکری فہمی کا بھی خود ہی پول کھول دیا۔

آخر میں مبین مرزا صاحب نے ایک نکتہ اور اٹھایا ہے، یعنی جاتے جاتے بھی باز نہیں آئے:

''میر کی شاعری کو فکری عناصر سے خالی سمجھنا خود اپنی سخن فہمی پر سوالیہ نشان قائم کرنے کے مترادف ہے۔''

یا اخی! یہ کن لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ کس بد بخت نے کہا ہے کہ میر کی شاعری فکری عناصر سے خالی ہے۔ یہ سوالیہ نشان کس احمق کی سخن فہمی پر لگایا جا رہا ہے اور لگانے والے کون ہیں؟ وہ جو میر کو سمجھنا اور محسوس کرنا تو در کنار، اسے ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتے!

پھر سند میں عسکری صاحب کے ہاں سے ایک ٹکڑا لا کر بڑ ہانکی ہے کہ یہ اکیلا اقتباس ہی اُس تھیسس کو shatter کرنے کے لیے کافی ہے.....

نہیں صاحب، بالکل نہیں۔ ہمارے دوست کسی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ سودا کا ایک شعر مرزا صاحب کی نذر ہے۔

گو پیر ہوئی شاعری سودا کی جوانو
تم سے نہ کھنچے گی یہ کماں سخت کڑی ہے

خدا معلوم مبین مرزا صاحب کس جھونک میں اچھل اچھل کر لات مارنے کی کوشش کیے جا رہے ہیں۔ کوئی اُنہیں پکڑ کر واپس کنویں میں ڈال دے ورنہ کہیں کچلے جائیں گے۔

O

بس اب کوئی چیز قابل جواب باقی نہیں رہی۔ سارے اعتراض نمٹ گئے۔ البتہ مبین مرزا صاحب نے ہماری گفتگو پر چند محترم بزرگوں کے تبصرے نقل کیے ہیں۔ اُن پر میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ان nemarks کو امانت سمجھنا چاہیے تھا، انہیں یوں شائع کر کے بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب جانتے ہیں کہ ان میں چار حضرات ایسے ہیں جن کا میں دیرینہ نیاز مند ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ حرکت فرمائی۔ اس سے شبہ ہوتا ہے

کہ یہ کام کسی نیک نیت اور جذبے سے کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ادھر سے، مبین مرزا صاحب نے مکالمہ ۵ کے اداریے میں اور پھر مکالمہ ۸ کے اس مضمون میں ایک عجب بدذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ ''عسکری صاحب پیغمبر نہیں ہیں۔'' بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ عسکری پرستی ہی کا ایک expression ہے، یہ پیپ اسی ناسور سے نکلی ہے۔

مبین مرزا صاحب اور صابر وسیم صاحب نے مضمون نگاری کا شوق تو پورا کر لیا مگر انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ یہ شوق اتنا بھاری ثابت ہوگا۔ ان بھلے مانسوں کو اس اوکھلی میں سر نہیں دینا چاہیے تھا۔ اگر میری گفتگو کا تیا پانچا ہی کرنا تھا تو کسی کارداں آدمی کی رہنمائی حاصل کرتے۔ اس طرح کوئی ایک آدھ بات تو ایسی کر ہی گزرتے جس پر اُن کا شکریہ ادا کرتا اور اپنی اصلاح کر لیتا۔ موجودہ صورت میں تو یہ مضامین اُس کوڑے کرکٹ کی طرح ہیں جنہیں صاف کرنا ایک علمی، ادبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔

مجھے ہرگز یہ خوش فہمی نہیں ہے کہ وہ گفتگو اغلاط سے مبرا ہے۔ خصوصاً مجھ سے تو کئی حماقتیں صادر ہوئی ہیں۔ اب خیال آتا ہے کہ اُس مکالمے کو جوں کا توں نہیں چھپنا چاہیے تھا۔ کئی مقامات پر قلم لگنا ضروری تھا۔ یہ نہ کرنے سے گفتگو کہیں کہیں خاصی غیر متوازن، ناہموار اور معمولی استعداد والوں کے لیے گنجلک ہوگئی ہے۔ اگر صابر وسیم صاحب اور جناب مبین مرزا میرے ہی پاس آ جاتے اور اس گفتگو کی غلطیاں اور خامیاں معلوم کرتے تو خدا شاہد ہے، میں انہیں مایوس نہ کرتا۔ ایسی ایسی باتیں کھولتا کہ یہ میری ہی داڑھی نوچنے کے قابل ہو جاتے۔ لیکن اللہ کو شاید یہی منظور تھا کہ دونوں دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بن جائیں، سو بندہ کیا کر سکتا ہے۔

خیر، اب بتاتا ہوں کہ میں نے اپنی گفتگو میں کہاں کہاں جہالت اور لغویت کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۔ قحطِ انفعال کے مسئلے پر میں نے جو کچھ بھی کہا، اُس کی حیثیت زیٹ زپٹ سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اس میں جہالت کے ساتھ میری خباثت بھی شامل ہوگئی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ موقع پر مجھے اس کا پتا نہ چلا۔ عسکری صاحب کا مضمون بے مثال ہے۔ میرا اختلاف شرمناک حد تک جاہلانہ ہے۔

۲۔ Phenomenologist والا قصہ بھی نری بے ہودگی، بدذوقی اور کج اندیشی ہے۔ اس کا حرف حرف غلط اور بے تکی ہے۔

۳۔ سلیم احمد پر عسکری کے اثرات کا بیان خاصا مبالغہ آمیز ہے۔ میں واقعی شرمندہ ہوں کہ آپ کو اتنا لمبا اور درشت خط پڑھنے اور چھاپنے کی مشقت اٹھانی پڑی۔ اب اس دُعا کے ساتھ قلم رکھتا ہوں کہ بارِ الٰہا آپ جانتے ہیں کہ میں نے سختی کا یہ رویہ ازراہِ نخوت اختیار نہیں کیا۔ ایک مصلحت پیشِ نظر تھی، اگر وہ حق بجانب ہے تو اُسے میرے لیے دُنیا و آخرت میں مفید بنا دیجیے، اور اگر غلط ہے تو اس کے شر سے حفاظت کا سامنا کر دیجیے اور میری توبہ قبول فرمائیے۔ آمین۔ فقط۔